ماہنامہ

میثاق

لاہور

صفر المظفر ۱۴۰۲ھ

-: مدیر مسئول :-

ڈاکٹر اسرار احمد

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور-۱۴ - فون: ۸۵۲۶۱۱، ۸۵۲۶۸۳

سالانہ زرِ معاونت: -/۲۰ روپے ، اس شمارے کی قیمت -/۳

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۰	صفر المظفر ۱۴۰۲ھ (دسمبر ۱۹۸۱ء)	عدد ۱۲

مشمولات

	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	عرض احوال	جمیل الرحمٰن	۱
۲	سانحۂ کربلا	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
۳	کربلا کی کہانی حضرت ابوجعفرؒ کی زبانی	مولانا عطاء اللہ حنیف	۳۴
۴	نشر القرآن (ریڈیائی تقاریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۴۱
۵	ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ جنوبی ہند میں پندرہ دن (رپورتاژ) پانچویں قسط	قاضی عبدالقادر	۵۱

مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن

ناشر: ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع: چوہدری رشید احمد

مطبع: مکتبہ جدید پریس ۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

صفر المظفر ۱۴۰۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۱ء کے اس شمارے سے میثاق کی تیسویں جلد مکمل ہو رہی ہے۔ ابتدائی تقریباً چودہ پندرہ سال تک ہر ششماہی پر جلد تبدیل ہوتی تھی لیکن ۱۹۷۲ء سے کیلینڈر ایئر کے مطابق جلد کا حساب بارہ شماروں سے کر دیا گیا۔ میثاق کے اجرا کو گو بیس اکیس سال ہوئے ہیں۔ لیکن جلدوں کے شمار کا فرق واقع ہو گیا ہے۔ اب بارہ شماروں ہی کی جلد کا حساب جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

تربیت گاہ جیسا کہ قارئین میثاق کو علم ہو گا کہ ہر سال ایک اقامتی تربیت گاہ کا انعقاد پیش نظر رہتا ہے بحمد اللہ امسال یہ تربیت گاہ ۷ تا ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوئی اور یہ بھی خاص اللہ کا فضل ہے کہ ہر تربیت گاہ تنوع اور افادیت کے لحاظ سے سابقہ سے بہتر ہوتی ہے۔ امسال تربیت گاہ کے پروگراموں کی ایک جھلک قارئین کرام کی واقفیت کے لئے پیش خدمت ہے۔

- روزانہ صبح بعد نماز فجر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ایک گھنٹے کا سورۃ حدید (مکمل) کا درس دیا۔ یہ مکمل درس ۶۰ کے ۵ کیسٹوں میں دستیاب ہے۔
- حیدر آباد سے جناب مولانا وصی مظہر صاحب ندوی تشریف لائے تھے موصوف نے دو لیکچرز دیئے۔ جن میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں کی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" پر تبصرہ فرمایا اور دلائل سے ان امور کو واضح کیا۔ جن سے وہ اپنے علم و فہم کے مطابق مولانا علی میاں اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے نظریات و افکار سے اتفاق یا اختلاف رکھتے تھے مولانا ندوی مدظلہٗ کے اس بے لاگ اور مخلصانہ محاکمہ سے سامعین نے بھرپور استفادہ کیا۔
- ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۴ یوم میں اپنی کتاب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام" کا اجتماعی مطالعہ کرایا اور موصوف بڑے شرح و بسط کے ساتھ اس

اہم موضوع کی وضاحت کی جس پر تقریباً سولہ سال قبل یہ لکھی گئی تھی — مزید براں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک اہم مضمون "اسلام اور پاکستان" کا بھی جو کئی سال قبل میثاق میں شائع ہو چکا تھا۔ اجتماعی مطالعہ کرایا۔ جس میں انتہائی مدلل طور پر ثابت کیا گیا تھا کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں بقاء کا بھی انحصار اس امر پر ہے کہ یہاں حقیقی طور پر "اسلام" نافذ ہو۔

● ایک نشست میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "اقبال اور ہم" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور اس کی وضاحتیں بھی فرماتے رہے۔

● روزانہ نماز عصر کے فوراً بعد پانچ یوم تک ملک کے نامور بزرگ دانشور جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے حسب ذیل موضوعات پر لیکچرز ہوئے۔

(۱) خصوصیات قرآن حکیم (۲) التوحید فی القرآن (۳) ہندوؤں نے تبلیغ اسلام کا راستہ کیسے روکا؟ (۴) ہندوستان میں تبلیغ کے ضمن میں مسلمانوں کی کوتاہی۔ (۵) موجودہ حالات میں ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے امکانات اور اسکی تدابیر۔ چشتی صاحب کے ان لیکچرز سے تربیت گاہ میں مقیم حضرات کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات نے استفادہ کیا جو روزانہ لاہور کے مختلف مقامات سے آتے تھے۔

● تقریباً سوا دو گھنٹے کی ایک نشست میں (بعد نماز مغرب) قدیم اور مخلص مسلم لیگی دانشور جناب مرزا محمد منور صاحب سے "تحریک پاکستان" کے موضوع پر گفتگو رہی۔ مرزا صاحب موصوف نے یوں گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں "تحریک پاکستان" کا پس منظر اور اسباب پر روشنی ڈالی پھر تقریباً سوا گھنٹے تک اس نشست نے مجلس مذاکرہ کی صورت اختیار کر لی۔ حاضرین نے سوالات کئے اور مرزا صاحب نے ان کے جوابات دیئے۔ اس طرح یہ مجلس بہت ہی کامیاب رہی۔

● امسال تربیت گاہ میں حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری مدظلہ، امیر تنظیم اہل سنت کی ملتان سے تشریف آوری ہوئی۔ مولانا علیل تھے لیکن وہ تشریف لائے اور ضعیف العمری اور علالت کے باوجود دو دن تک مغرب تا عشاء دو گھنٹے تک مولانا موصوف نے بالترتیب "حقیقت توحید" اور "حادثہ کربلا" پر نہایت مفصل تقریریں کیں۔ مولانا موصوف کو سننے کے لئے شہر سے

(بقیہ ص ۳۱)

ڈاکٹر اسرار احمد

سانحۂ کربلا

گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کے خطاب جمعہ کا کچھ حصہ قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ — جمعہ یعنی ۸ محرم الحرام کو ڈاکٹر صاحب نے 'سانحۂ کربلا' کے موضوع پر خطاب فرمایا تھا جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ (مرتب)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ط
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ ق وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ ۱۵۳ تا ۱۵۷) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ۔

— ان آیات کی تلاوت اور ادعیہ مسنونہ کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا:

"حضرات! دو دن بعد محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی دس تاریخ ہوگی جو 'یوم عاشور' کہلاتا ہے — یقیناً یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ ۱۰ محرم الحرام سن ۶۱ ہجری کو ایک نہایت افسوسناک حادثہ دشتِ کربلا میں پیش آیا تھا۔ جس میں سبطِ رسولؐ

سیدنا حضرت حسین ابنِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور آپؓ کے خانوادے کے اکثر افراد نیز آپؓ کے اعوان و انصار کی کثیر تعداد نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس حادثہ کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جانی چاہیئے کہ یہ اچانک ظہور پذیر ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ درحقیقت اُسی سبائی سازش کا ایک مظہر تھا جو پورے پچیس سال قبل اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک حادثے کو جنم دے چکی تھی۔ یعنی نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دوہرے داماد اور تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت —— حضرتِ عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ ۱۸؍ ذی الحجہ سنہ ۳۵ھ کو پیش آیا تھا اور ۱۶؍ اکتوبر (۱۷؍ ذی الحجہ) کے جمعہ کے اجتماع میں، میں نے حضرت عثمانؓ کی سیرت اور ان کی شہادت کے تاریخی پس منظر پر کچھ گفتگو کی تھی[1] جس پر زیادہ دن نہیں گزرے لہٰذا مجھے آج سہولت محسوس ہو رہی ہے کہ واقعہ کربلا کے بیان کے ضمن میں، مَیں اپنی گفتگو کا تسلسل اُسی کے ساتھ جوڑ سکتا ہوں۔

اوّلاً ذہن میں یہ بات تازہ کر لیجئے کہ حق و باطل کی جو کشمکش ازل سے چلی آ رہی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس کے ضمن میں ہمیں تاریخ کا کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے کہ زیادہ تر غلبہ باطل کا رہا۔ حق کے غلبے کے ادوار بڑے مختصر رہے ہیں یہ بھی ایک حقیقتِ کبریٰ ہے کہ جب کبھی حق کا غلبہ ہوا ہے تو باطل نے اُسے اپنی آخری شکست تسلیم نہیں کیا بلکہ ایسے مواقع پر وہ وقتی طور پر دبک جاتا رہا ہے۔ اُس نے منافقانہ طور پر حق کا لبادہ اوڑھ لیا ہے یا وہ وقتی طور پر زیرِ زمین چلا گیا ہے —— چنانچہ وہ اندر ہی اندر اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور ایسے موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ جب وہ حامیانِ حق کے درمیان کوئی شدید اختلاف و انتشار پیدا کر کے اپنے لئے راستہ بنا سکے۔ اور حق کے خلاف کھڑا ہو سکے۔

[1] اس خاص موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا پُر تاثیر خطاب "شہیدِ مظلوم" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے (مرتب)

چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین معجزہ دُنیا کو دکھا دیا۔ یعنی جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ کا نقشہ بالفعل قافلۂ انسانیت کو چشم سر سے دیکھنے کا موقع فراہم فرما دیا۔ اور ایک وسیع و عریض خطۂ زمین پر حق کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر رہتی دُنیا تک کے لئے ایک کامل نمونہ پیش فرما دیا۔ حق غالب اور باطل سرنگوں ہو گیا — لیکن باطل نے انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلے میں وہی روش اختیار کی کہ وقتی طور پر شکست تسلیم کر کے وہ اس انتظار میں رہا کہ موقع آئے تو میں وار کروں اور کاری وار کروں۔ چنانچہ آں حضورؐ کے انتقال کے فوراً بعد فتنوں کا ہجوم اُٹھ کھڑا ہوا۔ کئی کاذب مدّعیانِ نبوّت میدان میں آ گئے اور ان کے ساتھ کافی جمعیت ہو گئی۔ پھر مانعین و منکرینِ زکوٰۃ سے سابقہ پیش آیا اور اہل ایمان کو بیک وقت ایسے ایسے عظیم فتنوں سے نبرد آزما ہونا پڑا کہ وقتی طور پر تو محسوس ہوتا تھا کہ حق کا چراغ اب بجھا کہ بجھا! یہ درحقیقت وہ انقلاب دشمن قوتیں ——— (COUNTER REVOLUTION FORCES) — تھیں جن سے عہدہ برا ہونے کے لئے واقعتاً صدیق ہی نہیں بلکہ صدیقِ اکبر کی شخصیت درکار تھی۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ — صدیق دراصل نبی کا عکسِ کامل ہوتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے ثابت کر دیا کہ جس انقلاب کی تکمیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس فرمائی تھی اس کے خلاف آپؐ کی وفات کے بعد جو ردِّ عمل ظاہر ہوا، اس کی سرکوبی کرنے کی پوری صلاحیت اور عزیمت اور آہنی قوتِ ارادی ان کے نحیف و نزار جسم میں موجود تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کو مستحکم (CONSOLIDATE) کیا اور زمامِ کار حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے کر کے وہ بھی اپنے مالک حقیقی کی طرف مراجعت فرما گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اور جیسا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت والی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرتِ ذوالنورینؓ کے بارہ سالہ دورِ خلافت میں سے بھی کم و بیش دس سال

بالکل دورِ فاروقیؓ ہی کے شان کے حامل تھے لہٰذا ان کو بھی شامل کر لیجئے تو یہ بیس سال اسلام کے استحکام اور اس کی توسیع کے سال ہیں - انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نگیں عراق و شام و فارس (ایران) کے پورے پورے ملک اور شمالی افریقہ کا مصر سے مراکش تک کا وسیع علاقہ آگیا اور اس پر اسلام کا جھنڈا لہلہانے لگا اور اللہ کا دین حکمران و غالب ہو گیا — اب ظاہر بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ایک ردِ عمل ہونا تھا - یہ جو HISTORICAL PROCESS ہے، اس کے کچھ غیر متبدل اصول ہیں - آپ کے علم میں ہے کہ جس انقلاب کی تکمیل اندرونِ عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس فرمائی۔ اس کے ردِ عمل میں مخالفانہ تحریکیں (RE-ACTIONARY MOVEMENTS) اٹھ کھڑی ہوئیں تو توسیع کا جو مرحلہ آپؐ کے جانثاروں کے ہاتھوں انجام پایا، اس کا ردِ عمل کیوں نہ ہوتا - چنانچہ باطل نے پہلا وار کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ذات پر — باطل پرست یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ پوری عمارت اسی ایک ستون پر کھڑی ہے، اس کو گرا دو عمارت زمین بوس ہو جائے گی - الحمد للہ کہ ان کی توقع غلط ثابت ہوئی اور عمارت برقرار رہی — یہ سازش خالص ایرانی سازش تھی - ابولولو فیروز پارسی ایرانی غلام اور اس کی پشت پر ہرمزان ایک ایرانی جرنیل تھا۔ اس سازش کی ناکامی کے بعد جو دوسرا وار ہوا وہ بہت کاری وار تھا - اس میں یہود کی عیاری اور کیادی شامل تھی - ان کا سازشی ذہن اور اس میں مہارت ضرب المثل بن چکا ہے — عبداللہ بن سبا یمن کا ایک یہودی اٹھتا ہے — اسلام کا لبادہ اوڑھتا ہے، مدینہ منورہ میں آکر قیام کرتا ہے اور نئے نئے شگوفے چھوڑنے شروع کرتا ہے۔ کہیں محبتِ آلِ رسول کے پردے میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے متعلق وسوسہ اندازی کرتا ہے اور حضرت علیؓ کے استحقاقِ خلافت کا پروپیگنڈہ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور وہی خلافت کا حق دار ہوتا ہے تو اصل میں حضورؐ کے وصی حضرت علیؓ ہیں لہٰذا خلافت کے حقدار وہ ہیں - ان کی بجائے جو بھی مسندِ خلافت پر فائز ہوا یا اب ہے، وہ غاصب ہے - کہیں حضرت علیؓ کی الوہیت کے عقیدے کا پرچار کرتا ہے - جس سے اسلام کی جڑ "توحید" پر کاری ضرب

لگتی ہے - ایرانی نومسلم جن کی گھٹی میں نسلاً بعد نسلٍ شاہ پرستی اور HERO WORSHIP پڑی ہوئی تھی اور جو نسب کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی کے خوگر تھے - ان کے دلوں پر اس کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا — کہیں بظاہر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ثانی ہوگا تو ہمارے رسول جو افضل الانبیاء ہیں، وہ بھی دوبارہ واپس تشریف لائیں گے — اب دیکھئے کہ غیر عرب نومسلم خوش عقیدہ لوگوں کے دلوں کو یہ بات کتنی بھلانے والی ہے کہ اس طرح آں حضورؐ کی عظمت کا بیان ہو رہا ہے یہی حربہ ہے جو اس دور میں قادیانوں نے استعمال کیا - حضرت مسیحؑ کے آسمان پر اُٹھائے جانے اور ان کے نزول کے عقیدے کی نفی کرنے کے لئے انہوں نے اسی دلیل کا رُخ اس طرف رکھا کہ اس طرح تو ہمارے رسول کی عظمت مجروح ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے نبی تو فوت ہو گئے ہوں اور حضرت مسیحؑ آسمان پر زندہ موجود ہوں اور دوبارہ تشریف لائیں - گویا اصل بات یہی ہے کہ عوام الناس کی اکثریت عقیدت کی بنیاد پر اس قسم کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتی ہے - ان باتوں نے سادہ لوح لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا - یہ شخص مدینہ سے بصرہ گیا، وہاں اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا - پھر کوفہ گیا وہاں ایک اور مرکز قائم کیا - دمشق جا کر وہاں کوشش کی لیکن وہاں دال نہیں گلی - پھر مصر گیا وہاں اپنے ہم خیالوں کی ایک جماعت پیدا کی اور ہر طرف اس نے ایک فتنہ و فساد کی فضا پیدا کر دی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری دو سال اس فتنہ و فساد کی نذر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت ہوئی جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین مظلومانہ شہادت ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت عظیم ترین مملکت کے فرمانروا تھے، لاکھوں کی تعداد میں فوجیں موجود تھیں جو ان کے اشارے پر کٹ مرنے کیلئے تیار تھیں - جب مٹھی بھر باغیوں نے اس شہید مظلومؓ کا محاصرہ کر رکھا تھا تو مختلف صوبوں کے گورنروں کی طرف سے استدعا آ رہی تھی کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم فوجیں لے کر حاضر ہو جائیں اور ان باغیوں کی سرکوبی کریں - لیکن وہ امام وقتؓ

یہ عزم کئے ہوئے ہے کہ میں اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی مسلمان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا، اتنی عظیم قوت و سطوت کا حامل اور اس طرح اپنی جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے اور اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کا خون بہانے کے لئے تیار نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہمارے ہاں شاعری میں بے پناہ مشرکانہ اوہام موجود ہیں۔ غلط فکر اور عقیدوں کی ترویج میں شاعری نے بہت حصہ لیا ہے۔ ایسے اشعار زبان زدِ عوام و خواص ہو جاتے ہیں، جن میں غلو بھی ہوتا ہے اور غلط فکر بھی۔ شعراء کے متعلق قرآن حکیم نے یہ دوٹوک بات فرمادی ہے کہ:۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ "اور شعراء کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔" محتاط ترین لوگ بھی جب شاعری کی ترنگ میں آتے ہیں تو ان کی زبان و قلم سے بھی غیر محتاط اور غلط باتیں نکل جاتی ہیں۔ مثلاً آپ علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کیجئے ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم　　نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

غور طلب بات یہ ہے کہ شہادت حسینؓ اور ذبح اسمٰعیلؑ میں کون سی چیز مشترک ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ کون ہوئے؟ اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر! ۔ کیا حضرت حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت بھی کسی ایسے ہی جلیل القدر شخص کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔ کونسی قدر مشترک ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ نے تو ذبح ہونے کے لئے خود ہی اپنی گردن پیش کی تھی بفحوائے آیت قرآنی: فَلَمَّآ اَسْلَمَا ۔ پس جب ان دونوں (باپ بیٹوں) نے سرِ تسلیم خم کر دیا"، باپ اور بیٹے دونوں نے فرماں برداری کی بے مثال اور تاریخ ساز مظاہرہ پیش کیا لہٰذا اس آیت میں تثنیہ کا صیغہ اَسْلَمَا آیا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ اور وہ "فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ" (سورۂ توبہ) "تو وہ قتل کرتے

بھی ہیں اور کبھی) قتل ہو بھی جاتے ہیں،، کے مصداق کامل بنے تھے تو وہ کونسی بات ہے جو ان دونوں واقعات کے مابین کسی پہلو سے مشترک قدر قرار دی جا سکتی ہے! پھر وہاں تو ارادۂ ذبح تھا۔ لیکن ذبح بالفعل ہوا نہیں۔ یہاں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالفعل شہید کیے گئے ہیں لہٰذا ان واقعات میں آپ کو کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی۔ ہاں ایک واقعاتی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم

بقید حیات ہوتے تو ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو تبدیل کر کے یوں کر دیا جائے تو واقعاتی اقدار کا اشتراک پیدا ہو جائے گا کہ:۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی ہیں عثمانؓ ابتدا ہابیلؑ

حضرت ہابیل کا قتل ہوا ہے اور اس شان کے ساتھ ہوا ہے کہ بھائی قتل پر تلا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ (آیت ۲۸) انہوں نے اپنے بھائی قابیل سے کہا "اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تب بھی میں اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا تم کو قتل کرنے کے لئے۔" اور ہابیل قتل ہو گئے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کا کلام اللہ میں سورۃ المائدہ میں بڑے اہتمام اور بڑی شان کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس پر ہمیں وہ آیت مبارکہ ملتی ہے کہ اسی لئے ہم نے یہ لکھ دیا ہے کہ جس شخص نے بھی کسی ایک انسانی جان کو ناحق اور بغیر سبب قتل کیا تو اس نے گویا پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے ایک بھی جان بچائی، اس نے گویا پوری نوع انسانی کی جان بچائی۔ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (آیت ۳۲) یہ واقعہ حضرت ہابیل کا ہے۔ اس کی کامل مناسبت اور مشابہت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت میں ہے۔ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوئے۔ طاقت ہے، قوت ہے، سب کچھ ہے حضرت طلحہ، حضرت زبیر ابن العوام۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم محاصرین کی سرکوبی کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ انصار آ رہے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے، ہم دوسری مرتبہ اللہ کے انصار بننا چاہتے

ہیں۔ پہلے ہم نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانثاری میں اللہ کے مددگار ہونے کا خطاب حاصل کیا ہے آج ہم خلیفۃ الرسول کی مدد کے خواستگار ہیں، ہمیں موقع دیجئے کہ ہمارے اس خطاب کی پھر تجدید ہو جائے۔ مختلف صوبوں کے گورنروں کے جو پیغامات آرہے تھے کہ ہمیں فوجیں لے کر آنے کی اجازت دیجئے اس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ حضرتِ عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا جو صبر و ثبات کے کوہ ہمالیہ ثابت ہوئے، جواب یہی تھا کہ نہیں، میں اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ دروازے پر پہرہ دار تھے۔ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہم۔ لیکن پیچھے سے باغی دیوار پھاند کر گئے اور اس ہستی کو شہید کر دیا جس کو ذوالنورین کا لقب حاصل تھا اور جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے اور جس کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ "اے اللہ، میں عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہیو"۔

—— حضرت عبداللہؓ بن سلام جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جید یہودی عالم تھے، وہ آتے ہیں اور باغیوں کو مخاطب کرتے ہیں کہ لوگو! باز آجاؤ۔ میں تورات کا عالم ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم از کم ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں یا کبھی کسی نبی کے خلیفہ کو قتل کیا گیا ہو، اس کے بعد کم از کم پینتیس ۳۵ ہزار انسانوں کو قتل نہ کیا گیا ہو، —— جان لیجئے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے کی آگ بھڑکی، اس میں چوراسی ۸۴ ہزار مسلمان قتل ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے عہدِ خلافت کے پورے پورے پانچ برس باہم خانہ جنگی میں گزرے۔ جنگ جمل ہے اور جنگ صفین ہے۔ جنگِ نہروان ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں مسلمان کا گریبان ہے اور مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کا خون چاٹ رہی ہے۔ مسلمان کا نیزہ ہے جو مسلمان کے سینے کے پار ہو رہا ہے اور کیسے کیسے لوگ! حضرت طلحہؓ شہید ہو رہے ہیں، حضرت زبیرؓ شہید ہو رہے ہیں حضرت عمار بن یاسرؓ شہید ہو رہے ہیں۔ پھر یہ کہ حضرتِ علیؓ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرتِ امیر معاویہؓ پر حملہ ہوا لیکن ان پر وار کاری نہ پڑا اور وہ بچ گئے۔

حضرت عمرو ابن العاصؓ پر حملہ ہوا، لیکن وہ اُس روز کسی وجہ سے نمازِ فجر کیلئے آئے نہ تھے، اس لئے ان کے مغالطے میں ان کے قائم مقام شہید ہوئے۔ پھر نہ جانے ان کے علاوہ کیسے کیسے مخلص اور شجاع مسلمان ان جنگوں میں کھیت رہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ اس سارے فتنے کی آگ بھڑکانے والے عبداللہ بن سبا کے حواری تھے اور یہ وہ آگ تھی جو پھر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس سبائی سازش کو سمجھنے کے لئے میں جنگ جمل کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں جو تمام مستند تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا جب فوج کے ساتھ نکلی ہیں اور بصرہ پر ان کا قبضہ ہوا۔ حضرت عائشہؓ خلافت کی مدعی نہیں تھیں، معاذ اللہ۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس وقت دونوں لشکر آمنے سامنے تھے اور حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ جنگ کے بجائے گفت و شنید سے قضیہ نمٹانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے یہ بات سامنے آئی کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے بالکل تیار ہیں، لیکن پہلے ان کے ہاتھ تو مضبوط کئے جائیں۔ اگر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے اور انہیں تقویت پہنچائی جائے تو وہ فتنہ پردازوں سے پورا پورا حساب لیں گے۔ لہٰذا بات چیت شروع ہوئی۔ ایک بڑی اُمید افزا فضا نظر آنے لگی کہ حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن عین اُس وقت عبداللہ بن سبا اور مالک بن اشتر نخعی رات کی تاریکی میں سازش کرتے ہیں کہ اس طرح تو ہمارا بھانڈا پھوٹے گا۔ ہماری سازش کا پردہ چاک ہوگا۔ یہ جو ڈرامہ کھیلنے کے لئے ہم نے اسٹیج بچھائی ہے، یہ تو برباد ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کو لے کر حضرت عائشہؓ کے کیمپ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اِدھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اُدھر وہ حضرت علیؓ کے کیمپ میں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر نے حملہ کی ابتدا کی ہے اور وہ اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے پوری طرح بھڑ گئے۔ آپ اس بات کو پیشِ نظر رکھئے کہ جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو تحقیق کا وقت کوئی نہیں ہوتا اور یہ قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ

عین اس وقت تفتیش ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے ؟ کس نے ابتدا کی تھی اور اس کا اصل محرک کیا ہے ؟ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھے برسرِ پیکار ہوتے ہیں — پھر جو خوں ریزی ہوئی ہے اور سو دو سو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ایک دوسرے کی تلوار سے شہید ہوئے ہیں یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب ہے - اس سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ واقعتہً فتنے کی آگ کو بھڑکانے والا چھوٹا سا گروہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو اس کو اس طرح بھڑکا دے کہ پھر اُسے بجھایا نہ جا سکے - یہی معاملہ جنگ صفین کے موقع پر ہوا ہے - وہاں بھی مصالحانہ گفتگو کی فضا پیدا ہو گئی تھی، لیکن سبائی سازشی گروہ نے اُسے بھی ناکام بنا دیا اور فتنہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں خوارج کے گروہ کا اضافہ ہو گیا اور ایک نیا محاذ کھل گیا -

آگے چلئے - وقت کی قلت کی وجہ سے مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے اختصار کے ساتھ کرنا ہے - حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک خارجی کے ہاتھوں شہادت ہوتی ہے - اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں عالم اسلام ایک وحدت کی صورت میں باقی نہیں رہا تھا - امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ شام کے گورنر کی حیثیت سے اس بات کے مدعی تھے کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لیا جانا چاہیئے - یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرتِ معاویہؓ نے قطعاً خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا - وہ ہرگز مدعی خلافت تھے - نہ حضرت علیؓ کی خلافت کے منکر - وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ حضرت علیؓ خلافت کے حق دار نہیں ہیں - معاذ اللہ - اور یہ کہ ان کے بدلے مجھے خلافت ملنی چاہیئے ہرگز نہیں - وہ صرف خونِ عثمانؓ کے قصاص کے مدعی تھے — ان کی ایک وسیع رقبے پر بحیثیت گورنر حکومت رہی ہے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ قاتلانِ عثمانؓ کو جو حضرتِ علی رضؓ کے کیمپ میں شامل اور معاملات میں پیش پیش تھے سزا دی جائے - اس کے بعد وہ بیعت کر لیں گے — ان کا موقف صحیح تھا یا غلط - اس پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں ہے - فی الوقت پیشِ نظر صرف اس صورتِ واقعی کا بیان ہے کہ اُس وقت عالم اسلام ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں تھا -

حضرتِ علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ میں حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی - اب معلوم ہوا کہ نئے سرے سے تصادم کی نوبت آنے والی ہے - اِدھر حضرتِ حسنؓ کوفے سے چالیس ہزار فوج لے کر چلتے ہیں - اُدھر حضرت معاویہؓ دمشق سے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوتے ہیں مدائن کے آس پاس دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوتی ہے - حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی فوج کا ہراول دستہ آگے آگے جا رہا تھا - اس کے متعلق یہ افواہ اُڑ گئی کہ اس کو شکست ہوگئی - یہ افواہ کس نے اڑائی - واللہ اعلم - نتیجہ یہ نکلا کہ وُہی کوفی جو حضرت حسنؓ کے ساتھ تھے، انہوں نے وہاں وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہے کہ بیان سے باہر ہے - بغاوت کر دی، خیمے لوٹ لئے جناب حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ پر دست درازی کی آن جنابؓ کے کپڑے پھاڑ ڈالے - ان باغی کوفیوں کے ہاتھوں اپنی جان کا خطرہ دیکھ کر آنجنابؓ کو کسریٰ کے محل میں پناہ لینی پڑی - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرتِ حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ان کوفیوں کے مزاج کا بخوبی تجربہ ہوگیا - چنانچہ انہوں نے مصالح دین کی خاطر وہیں سے حضرت معاویہؓ کو مصالحت کی پیش کش ارسال کر دی - جسے حضرت معاویہؓ نے فوراً قبول کر لیا اور اپنی طرف سے ایک سادہ سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر حضرتِ حسنؓ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ جو شرطیں آپ چاہیں لکھ دیں، مجھے منظور ہوں گی - جس کو ہم (BLANK CHEQUE) سے تعبیر کر سکتے ہیں - چنانچہ مصالحت ہوگئی - مصالحت نامہ میں ایک شرط یہ تھی کہ ایران کے صوبے اہواز کا خراج حضرت حسنؓ کو ملے گا - یہ ایران کا وہی صوبہ ہے جس کا آجکل اخبارات میں ایران و عراق کی جنگ کے سلسلے میں کافی ذکر ہو رہا ہے - اور جہاں عرب کافی تعداد میں آباد ہیں - ایک دوسری شرط یہ تھی کہ بیس لاکھ درہم سالانہ میرے چھوٹے بھائی حسینؓ کو ملیں گے - ایک اور شرط یہ بھی تھی کہ وظائف کی تقسیم کے معاملے میں بنی ہاشم کے حق کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تسلیم کیا جائے گا - ایک شرط یہ بھی تھی کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر کسی سے باز پرس نہیں ہوگی گویا یہ عام معافی (AMNESTY)

(GENERAL- کا اعلان تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے تمام شرائط منظور کرلیں اور الحمدللہ تقریباً پانچ سال کے اختلاف، افتراق، انتشار اور باہمی خانہ جنگی کا دروازہ بند ہوا۔ اب پورا عالم اسلام ایک وحدت بن گیا۔ واضح رہے کہ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیعتِ خلافت لی ہے۔ اس صلح کے واقعہ پر حضرت حسینؓ نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کہ "اگر خلافت ان کا یعنی حضرت معاویہؓ کا حق تھی تو ان تک پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں نے بھی ان کو سونپ دی۔ جھگڑا ختم ہوا"۔ یہ وہ بات تھی جس کی پیش گوئی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ میرے اس بیٹے یعنی حضرت حسنؓ کے ذریعے اللہ تعالےٰ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت کرائے گا۔ یہ خصوصی مقام اور رتبہ ہے۔ جنابِ حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا — "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!" — لیکن ذہن میں رکھیئے۔ وہ سازشی سبائی اس صورتِ حال سے سخت مشتعل تھے۔ انہوں نے حضرتِ حسنؓ پر طعن کیا۔ آپؓ کی طرح طرح سے توہین کی آپؓ کو "یا عارالمومنین" یعنی "اے اہل ایمان کے حق میں عار اور ننگ اور شرم کے باعث انسان" اور "یا مذل المومنین" یعنی "اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے انسان" کہا گیا۔ یہ توہین آمیز خطابات وہ لوگ آپؓ کو دیتے تھے جو بظاہر آپکے حامی تھے وہ برملا کہتے تھے کہ اے حسنؓ تم نے یہ صلح کرکے ہماری ناک کٹوا دی ہے اور "اہل ایمان" کے لئے تم نے کوئی عزت کا مقام باقی نہیں رکھا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ اس امت کی طرف سے ابدالاباد تک حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو جزا عطا فرمائے کہ ان کے اس ایثار کی بدولت وہ رخنہ بند ہوگیا اور وہ دراڑ پُر ہوگئی جو عالمِ اسلام میں اس آپس کے خلفشار کی وجہ سے پڑگئی تھی۔ اب اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ پورے بیس برس تک عالم اسلام پھر متحد رہا۔ یہ بات میں اس سے پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے عہدِ حکومت کو اہلِ سُنّت دورِ خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں کرتے۔ اسلامی حکومت کا آئیڈیل مزاج وہ ہے جو ہمیں حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرتِ عثمانؓ کے ابتدائی دس سال تک نظر

آتا ہے ۔ حضرت معاویہؓ صحابی اور کاتبِ وحی ہیں ۔ کسی بدنیتی کو ہم انؓ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور صحیح ہے کہ انؓ کا وہ مقام اور مرتبہ کبھی کسی نے نہیں سمجھا جو حضرت علیؓ کا ہے رضی اللہ عنہ ۔ میں نے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے اور اس کا آج پھر اعادہ کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جو جھگڑے رہے اور مسلمانوں میں آپس میں جو جنگیں ہوئیں، حاشا وکلّا ان کا کوئی الزام حضرت علیؓ کی ذات پر نہیں ہے ۔ اس میں انؓ کا نہ کوئی قصور تھا نہ کوتاہی ۔ معاذ اللہ ۔ یہ تو اغیار کی سازش تھی کہ انہوں نے فتنہ کی آگ کو اس طرح بھڑکایا تھا کہ اس کو بجھایا نہ جا سکا ۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت کے یہ بیس سال امن کے سال ہیں ۔ باہمی خانہ جنگی ختم ہو گئی ۔ ؏ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا "کی کیفیت پیدا ہوئی اور دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال کے عمل کا احیاء ہوا ۔ توسیع ازسرِ نو شروع ہوئی ۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا ۔ یہ بیس سالہ دَور خلافتِ راشدہ کے بعد اُمّت کی تاریخ میں جتنے بھی ادوار آتے ہیں، ان میں سب سے افضل اور بہتر دور ہے ۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے ۔ سب سے اہم بات یہ کہ سربراہ حکومت ایک صحابیؓ ہیں ۔ ان کے بعد معاملہ آتا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا لیکن وہ صحابی نہیں ہیں ۔ تابعی ہیں "؏ گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی !" ۔ ہم کسی غیر صحابی کو صحابی کے ہم پلّہ اور ہم مرتبہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں ۔ اہل سُنّت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اُمت کے بڑے سے بڑے ولی سے افضل ہے ۔

چنانچہ یہی بات ایک دوسرے انداز میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے کہی تھی ۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ افضل ہیں یا امیر معاویہؓ، انہوں نے جواب دیا کہ "معاویہؓ سے عمر بن عبدالعزیزؒ کے افضل ہونے کا سوال کیا پیدا ہوگا ۔ عمر بن عبدالعزیزؒ سے تو وہ خاک بھی افضل ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کے نتھنوں میں گئی ہے " یہ فرق ہے صحابیت اور غیر صحابیت میں ۔

بہرحال میں نے عرض کیا کہ امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت کے بیس سال میں امن رہا - واضح رہے کہ حضرت حسینؓ بھی وہیں ہیں، رضی اللہ تعالےٰ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ بھی دس سال تک زندہ رہے - سن ۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی تھی اور سن ۵۱ ھ میں حضرتِ حسنؓ کا انتقال ہوا ہے - ان کا انتقال زہر کے اثر سے ہوا، زہر کس نے دیا، کیوں دیا؟ اس کا تعلق حضرتِ معاویہؓ سے ہونا بعید از قیاس ہے - اُن کو کیوں ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ حضرتِ حسنؓ کو زہر دلواتے - جبکہ صلح کے بعد ان دونوں کے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے - زہر دینے والا کوئی سمجھ میں آسکتا ہے تو وہ وُہی گروہ ہوسکتا ہے کہ جس نے آں جنابؓ کو "عار المومنینؓ" اور "مذلّ المومنین" جیسے اہانت آمیز خطابات دیئے تھے اور آپؓ کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچائی تھیں ظاہر ہے کہ زہر دلایا ہوگا تو اسی گروہ نے دلوایا ہوگا - جن سے ان کی مصالحت ہے ان کی طرف سے زہر دلانے کا امکان بہرحال عقل انسانی تسلیم نہیں کرسکتی -

اس کے بعد آتا ہے امیر یزید کی بحیثیت ولی عہد نامزدگی اور پھر ان کے دورِ حکومت میں سانحہ کربلا کا واقعہ جو دردناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی اور جس نے بلاشک و شبہ تاریخ اسلام پر بہت ہی ناخوشگوار اثرات چھوڑے ہیں - اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ سے عرض کروں کہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ اگرچہ اُمّت میں اختلاف اور افتراق کے افسانے بہت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے باقی اختلافات فقہی اختلافات ہیں عقائد کے اختلافات نہیں ہیں - عقائد کے اختلافات تو ہمارے ہاں کے کچھ نچلی سطح کے نام نہاد واعظین اور مولویوں نے بنالئے ہیں کہ جن کی دوکان چلتی ہی ان اختلافات کے بل پر ہے - ورنہ ذہن میں رکھیئے کہ دیوبندی ہوں، بریلوی ہوں ان کے عقائد ایک ہیں، عقائد کی مستند کتب ان کے ہاں ایک ہیں - ان کی فقہ بھی ایک ہے - پھر اہل سُنّت کے جو دوسرے گروہ ہیں، وہ مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہل حدیث ہوں، ان میں فقہی معاملات میں اختلافات ہیں، عقائد ایک ہی ہیں - ہاں عقائد میں جو اختلاف اور فرق واقع ہوا ہے تو وہ شیعوں

اور سنّیوں کے مابین ہوا ہے۔ اس اختلاف کو واقعتہً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی واقعات کے بارے میں رائے اور سیاسی اختلافات کو ایک طرف رکھا جا سکتا ہے۔ شخصیات کے بارے میں بھی اگر اختلاف ہو تو اُسے بھی کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کسی کا ذاتی رجحان اگر یہ ہو کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ سے افضل سمجھتا ہو، تو یہ بھی ایسی بنیادی و اساسی بات نہیں ہے کہ جس کی بنا پر مُن دیگرم تو دیگری کا معاملہ ہو سکے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پوری اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو افضل ترین شخصیت ہی نہیں سمجھتی بلکہ پوری نوعِ انسانی میں انبیاء کرام کے بعد افضل البشر سمجھتی ہے لیکن اسے بھی عقیدے کا بنیادی اختلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ یہ لکھتے ہیں کہ "اگر میری طبیعت کو اس کی آزادی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ حضرت علیؓ کی فضیلت کی قائل ہوتی نظر آتی ہے لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ میں حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی فضیلت کا اقرار کروں" میرے ناقص رائے میں خلفائے راشدین کی فضیلت میں تقدیم و تاخیر اگرچہ فی نفسہٖ ایک اہم مسئلہ ہے تاہم اسے عقیدے کا اختلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اصل اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک معصومیت ختم ہو چکی ہے۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے نزدیک آں حضورؐ خاتم النبیین والمرسلین کے ساتھ ساتھ خاتم المعصومین بھی ہیں اور ہم اسے ایمان بالنبوت اور ایمان بالرسالت کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں اور یہ بات یقیناً بنیادی عقیدے سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ ختم نبوت کا لازمی نتیجہ ہے چونکہ عصمت و معصومیت خاصۂ نبوت ہے، نبوت ختم ہوئی تو عصمت و معصومیت بھی ختم ہوئی۔ اب نبوت کے بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ وحی نبوت کا دروازہ بند ہے اور تا قیام قیامت بند رہے گا۔ تاریخ انسانی کا بقیہ سارا دور اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد میں مجتہد اپنی امکانی حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی رائے قرآن و سنّت ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ لیکن وہ معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔ اس اجتہاد میں خطاء بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر نیک نیتی کے ساتھ خطا ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مجتہد مخطی کو بھی اجر و ثواب ملے گا۔

اگرچہ اکہرا - اور مجتہد اگر مصیب بھی ہو یعنی صحیح رائے تک پہنچ گیا ہو تو اُسے دوہرا اجر ملے گا - جبکہ شیعہ مکتب فکر کا عقیدہ امامتِ معصومہ کا ہے - ہمارے نزدیک جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا معصومیت خاصۂ نبوّت ہے - وہ اپنے آئمہ کو بھی معصوم مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان سے خطاء کا صدور ممکن نہیں - ہمارے اعتبار سے تو اس نوع کی امامت ایک قسم کی نبوّت بن جاتی ہے - اور ہر قسم کی نبوّت کو ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم سمجھتے ہیں - لہٰذا نبوّت کے بعد جو بھی زمانہ آیا اس میں کسی کا جو بھی اقدام ہے اس میں ہم احتمالِ خطاء کو بعید از امکان نہیں سمجھتے - خواہ وہ اقدام حضرت علیؓ کا ہو خواہ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کا - لہٰذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے بارے میں یہ رائے دینا چاہے کہ فلاں معاملے میں انؓ سے خطاء ہوئی تو اُسے حق ہے، وہ کہہ سکتا ہے البتہ دلیل سے بات کرے اور اُسے اجتہادی خطاء سمجھے تو یہ بات ہمارے عقیدے سے نہیں ٹکرائے گی - یہ دوسری بات ہے کہ پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کے دَور سے لے کر آج تک کسی شخص نے صدّیقِ اکبرؓ کی کسی خطاء کو پکڑا نہیں ہے - لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ امکانِ خطاء موجود تھا - اور وہ معصوم عن الخطاء نہیں تھے، لہٰذا کوئی شخص اگر یہ کہنا چاہے کہ ان سے یہ خطاء ہوئی، یہ نہ کرتے یا یوں کرتے تو بہتر تھا تو ہم اس کی زبان نہیں پکڑیں گے - چونکہ ہم ان کی معصومیت کے قائل ہی نہیں ہیں حضرت عمرؓ کو تو خود اپنی بعض اجتہادی آراء میں خطاء کا احساس ہوا، جن سے انہوںؓ نے علی الاعلان رجوع کر لیا - البتہ اپنی ایک خطاء کا وہؓ صرف اعتراف کر سکے، اس کا ازالہ نہ ہو سکا - وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں خود انہوں نے حضرت ابوبکرؓ پر زور دے کر وظائف کی تعیّن کے معاملے میں ایک فرق رکھوایا یعنی یہ کہ بدری صحابہ کو دوسروں کے مقابلے میں کافی زیادہ وظیفہ ملنا چاہیئے، اور اصحابِ شجرہ کو بدری صحابہ سے کم لیکن دوسروں سے زیادہ وظیفہ ملنا چاہیئے - یہ فرق مراتب حضرت عمرؓ نے رکھوایا - اور اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایّام میں آپؓ اس پر پچھتاتے - اس کی وجہ کیا تھی ؟ وہ بھی جان لیجئے یعنی یہ کہ اللہ تعالےٰ

کی نصرت اور مسلمانوں کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کی وجہ سے نہایت عظیم الشان فتوحات ہوتی چلی گئیں اور مالِ غنیمت بے حد و حساب دار الاسلام میں آنے لگا۔ اب جو بڑے بڑے وظائف باقاعدگی سے ملے تو اس نے سرمایہ داری کی شکل اختیار کر لی۔ اس لئے کہ معاشرے میں بالفعل یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی کہ صدقہ خیرات لینے والا کوئی مستحق ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ بنا بریں از نکاز دولت کی شکل پیدا ہونی شروع ہو گئی اور وظائف میں فرق و تفاوت نے اصحابِ دولت و ثروت کے مابین بھی عظیم فرق و تفاوت پیدا کر دیا۔ اگر وہ دولت کسی ہموار و مساوی طریقے پر منتقل ہوتی تو یہ صورتِ حال رونما نہ ہوتی۔ یہ وہ چیز تھی جس کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ "لو استقبلتُ ما استدبرتُ لأخذتُ فضولَ اموالِ الأغنیاءِ و لقسمتہ بین الناس" (او کما قال) "اب اگر کہیں وہ صورتِ حال دوبارہ پیدا ہو جائے جو پیچھے جا چکی ہے تو میں لوگوں کے اموال میں جو فاضل ہے وہ لے کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔" پس معلوم ہوا کہ آنجنابؓ کو ایک احساس ہوا۔ یہ بات میں نے صرف اس لئے عرض کی ہے کہ اہلِ سنت کا یہ موقف واضح ہو جائے کہ خطاء کا احتمال و امکان ہر صحابی کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اس خطاء کو اجتہادی خطاء قرار دیں گے۔ اسے نیک نیتی پر محمول کریں گے۔ یہ بات ہر صحابی کے بارے میں کہی جائے گی۔ یہی بات اور یہی رائے نہ صرف حضرت امیر معاویہؓ حضرت عمرو بن العاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی۔ یہاں تک کہ حضراتِ شیخینؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

لہٰذا یہ بات پیشِ نظر رکھئے کہ اب گفتگو کا جو مرحلہ آ رہا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ کے ایک اہم اقدام سے متعلق ہے۔ اس کے بارے میں بھی دو رائیں ممکن ہیں۔ ان کو یہ بات حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے سوجھائی (جو مسلمہ طور پر ایک نہایت ذہین و فہیم مدبر اور دور رس نگاہ رکھنے والے صحابی مانے جاتے ہیں) کہ

دیکھئے مسلمانوں میں آپس میں جو کشت وخون ہوا اور پانچ برس کا جو عرصہ آپس کی لڑائی جھگڑے میں گزرا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے بعد پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں۔ لہٰذا اپنی جانشینی کا مسئلہ اپنی زندگی ہی میں طے کر کے جائیے" اب کوئی شخص چاہے (اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے) تو وہ بڑی آسانی سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر یہ فتویٰ لگا دے کہ انہوں نے کسی لالچ اور کسی انعام کی امید کی وجہ سے یا چاپلوسی کے خیال سے یہ رائے دی۔ معاذ اللہ ہم یہ رائے نہیں دے سکتے۔ حضرتِ مغیرہ بن شعبہؓ ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہیں جنہوں نے حدیبیہ میں نبی اکرمؐ کے دست مبارک پر وہ بیعت کی تھی جس کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے چونکہ اس بیعت پر سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ وہؓ اصحابِ شجرہ میں سے ہیں۔ پھر حضرت علیؓ کے پورے عہدِ حکومت میں وہ حضرت علیؓ کے بڑے حامیوں (SUPPORTER) میں رہے اور ہر مرحلے میں انہوںؓ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دیا لیکن وہ اُمت کے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ آپس کی خانہ جنگی کا انہیں تلخ اور دردناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ جو انگریزی کی مثل ہے کہ "بہت سا پانی دریا میں بہہ گیا ہے" اس کے مصداق حالات میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہے یہ ۶۰ھ ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔ آں حضورؐ کی وفات پر پورے پچاس برس گزر چکے ہیں۔ کبار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظیم اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اب تو صغارِ صحابہؓ میں بھی کچھ ہی لوگ موجود ہیں۔ اور یہ گویا صحابہ کی دوسری نسل کے افراد ہیں جیسے حضرت زبیر بن العوامؓ شہید ہو چکے، اب ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ شہید ہو چکے اب ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ ہیں حضرت عباسؓ اللہ کو پیارے ہو چکے البتہ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ ہیں، الغرض چند صغار صحابہؓ کو چھوڑ کر تقریباً ننانوے فی صد لوگ تو بعد کے ہیں۔ پھر وہ جوشِ جذبۂ ایمانی بھی پچاس سال کے بعد اس درجے کا نہ رہا تھا جو خلافتِ راشدہ کے ابتدائی پچیس سال تک نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں

"جو ہر اندیشہ" اور شدّتِ احساس کا عالم تو یہ ہے کہ خود حضرت ابوبکرؓ نے ایک موقع پر جب کچھ عیسائی آئے اور ان کو قرآن مجید کی آیات سنائی گئیں اور شدّت تاثر سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ھٰکذا کُنّا حتّیٰ قَسَتِ القلوب" یعنی "یہی حال کبھی ہمارا ہوا کرتا تھا کہ قرآن مجید پڑھتے تھے اور سنتے تھے تو ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دل سخت ہو گئے"۔ ذرا غور فرمائیے یہ بات حضرت ابوبکرؓ اپنے متعلق فرما رہے ہیں کہ ہمارے دل سخت ہو گئے۔ اسی طرح انتقال کے وقت حضرت عمرؓ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میں اگر برابر برابر چھوٹ جاؤں تو بہت بڑی کامیابی سمجھوں گا" پھر یہی حضرت عمر فاروقؓ ہیں جو حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ "میں قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں۔ کہیں میرا نام ان منافقوں کی فہرست میں نہیں تھا جن کے نام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتائے تھے"۔ تو ان جلیل القدر صحابہؓ کے شدّتِ احساس کی یہ صورت تھی تو آپ سوچئے کہ ع "تا بہ دیگراں چہ رسد"۔ لہٰذا ان حالات میں حضرت مغیرہؓ کی سمجھ میں مصالح امّت کا یہی تقاضا آیا کہ امیر معاویہؓ اپنا کوئی جانشین نامزد فرما دیں۔ چونکہ اس وقت فی الواقع بحیثیت مجموعی امّت کے حالات اس جمہوری اور شورائی مزاج (REPUBLICAN CHARACTER) کے متحمل نہیں رہے ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا فرمایا تھا۔ لہٰذا حالات کے پیشِ نظر ایک سیڑھی نیچے اتر کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرتِ مغیرہؓ نے دلائل کے ساتھ حضرت معاویہؓ سے اصرار کیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کریں اور اس کی بیعت و لیعہدی لیں۔ پھر ان ہی نے جانشینی کے لئے جناب یزید کا نام تجویز کیا — یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے۔ کہ جو شخص بھی کسی درجے میں حضرت مغیرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہما کو بدنیّت قرار دے گا اس کا معاملہ اہل سنّت سے جُدا ہو جائے گا۔ اہلِ سُنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ "الصحابہ کُلّھم عدول"۔ بدنیتی کی نسبت ہم ان کی طرف نہیں کر سکتے، اختلاف کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں معصوم نہیں مانتے۔ ان سے خطا ہو سکتی ہے۔ ان کے کسی فیصلہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ کوئی

یہ کہے تو اس سے اس کے ایمان، عقیدہ اور اہل سُنّت میں سے ہونے پر کوئی حرف نہیں آئے گا - یہ رائے دی جا سکتی ہے لیکن جو شخص بدنیتی کو کسی صحابیٔ رسولؐ کی طرف منسوب کرتا ہے جان لیجئے کہ وہ اور خواہ کچھ بھی ہو بہر حال اہل سنّت والجماعت میں شمار نہیں ہوگا - اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے یعنی یہ کہ جن کی نیک نیتی ہر شبہ سے بالاتر ہے - انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ عمل اسلام کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھنے والا نہیں ہے - ان میں پانچ نام بہت مشہور ہیں - تین تو اُمّت کے مشہور معبادلہ، میں سے ہیں یعنی حضرت عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہم - ایک حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالےٰ عنہما اور ایک حضرتِ ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالےٰ عنہما - انہوں نے یزید کی بیعتِ ولی عہدی سے انکار کیا - اور ذہن میں رکھیئے کہ یہ تاریخی جملہ حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن ابی بکرؓ کا ہے کہ جب مدینہ کے گورنر نے ولی عہدی کی بیعت لینی چاہی ہے تو انہوں نے بڑے غصّے سے کہا "کہ "کیا اب تم رسُول اللہؐ اور خلفاء راشدینؓ کی سنّت کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سنت رائج کرنا چاہتے ہو کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہو" تیسری جانب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ان پانچ حضرات کو چھوڑ کر اُمّت کی عظیم ترین اکثریت نے بیعت کر لی - جس میں کثیر تعداد میں صحابہؓ بھی شامل تھے - اب اس واقعہ کے بعد اگر کوئی چاہے تو ان سب کو بے ضمیر قرار دیدے - کسی کی زبان کو تو نہیں پکڑا جا سکتا - کہنے والے یہ بھی کہہ دیں گے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے ان کے ایمان دولت کے ذریعے خرید لئے تھے - لیکن ذرا توقف کر کے غور فرمایئے کہ "ناوک نے صید نہ چھوڑا زمانے میں" کے مصداق سب سے پہلے اس زد میں حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ذاتِ گرامی آئے گی - گویا انہوں نے حضرتِ معاویہؓ کے حق میں دولت کے عوض دستبرداری قبول کر کے اپنی خلافت فروخت کی تھی - معاذ اللہ ثم معاذ اللہ - لیکن ایسی بات کہنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے کہ اس طرح ہدفِ ملامت و اہانت کون کون سی لائقِ صد احترام ہستیاں بنتی ہیں - ہم ان سب کو نیک نیت سمجھتے ہیں - جو بھی صحابہ کرامؓ اس وقت موجود تھے ان میں سے جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت

کی اور جنہوں نے انکار کیا وہ سب کے سب نیک نیت تھے۔ سب کے پیش نظر اُمت کی مصلحت تھی۔ حضرت حسنؓ نے جو ایثار فرمایا تھا وہ تو تا قیام قیامت اُمت پر ایک احسان عظیم شمار ہوگا۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھیئے کہ جو دوسرا مکتب فکر ہے وہ حضرت حسنؓ کو بھی امام معصوم مانتا ہے لہٰذا ان کا طرز عمل خود ان کے اپنے عقیدے کے مطابق صدق صد درست قرار پاتا ہے۔

اب آیئے حضرت حسین رضی اللہ تعالےٰ کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اہل سُنّت اس معاملے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ پوری نیک نیتی سے آں جنابؓ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے شورائی اور جمہوری مزاج کو بدلا جا رہا ہے۔ حالات کے رُخ کو اگر ہم نے تبدیل نہ کیا تو وہ خالص اسلام جو حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور وہ کامل نظام جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا، اس میں کجی کی بنیاد پڑ جائے گی، لہٰذا اسے ہر قیمت پر روکنا ضروری ہے۔ یہ رائے انؓ کی تھی اور پوری نیک نیتی سے تھی۔ پھر شہر کوفہ کے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے برابر ان کو پیغامات بھیج رہے تھے اور کوفیوں کے خطوط سے حضرت حسینؓ کے پاس بوریاں بھر گئی تھیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ کوفہ صرف ایک شہر نہیں تھا بلکہ اس کی سیاسی اور فوجی حیثیت سے بڑی اہمیت تھی۔ لہٰذا آنجنابؓ کی رائے تھی کہ اہالیانِ کوفہ کے تعاون سے وہ حالات کا رُخ صحیح جانب موڑ سکتے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ایسے تمام معاملات اجتہادی ہوتے ہیں۔ اس رائے میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بھی شریک تھے کہ ولی عہدی کی جو رسم پڑ گئی ہے وہ اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لیکن وہ آگے جا کر اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف تھا امکانات کے بارے میں۔ وہ کوفہ والوں کو قطعی ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی اقدام سے پہلے خوب اچھی طرح جائزہ لینا ہوتا ہے کہ اقدام کے لئے جو وسائل و ذرائع ضروری ہیں، وہ موجود ہیں یا نہیں۔ نبی اکرمؐ اور اہل ایمان پر قتال مکّے میں فرض نہیں ہوا تھا بلکہ مدینہ میں ہوا جبکہ اتنی قوت بہم پہنچ گئی تھی کہ قتال سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی مخلصانہ رائے تھی کہ کامیاب اقدام کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ فی الوقت

موجود نہیں ہیں - لہذا وہؓ حضرت حسینؓ کو کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنے اور وہاں جانے سے باصرار و الحاح منع کرتے رہے - لیکن حضرت حسینؓ کی رائے یہ تھی کہ کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنی چاہیئے اصل معاملہ یہ تھا کہ جو سچا انسان ہوتا ہے وہ اپنی سادگی اور شرافت میں دوسروں کو بھی سچا ہی سمجھتا ہے - اور اپنی صداقت کی بنیاد پر دوسروں سے بھی حسنِ ظن رکھتا ہے - کوفہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا - انتہائی STRATEGIC مقام پر کوفہ واقع تھا - یہ سب سے بڑی چھاؤنی تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں قائم کی گئی تھی - اس لئے کہ یہ وہ مقام ہے جس سے اس شاہراہ کا کنٹرول ہوتا ہے جو ایران اور شام کی طرف جاتی ہے - لہذا حضرت حسینؓ یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر کوفہ کی عظیم اکثریت ان کا ساتھ دینے کیلئے آمادہ ہے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے تو کامیابی کے امکانات غالب ہیں اس لئے کوفیوں کی دعوت کو قبول کر لینا چاہیئے - جس کے ذریعہ اسلامی نظام میں جو تبدیلی لائی جا رہی ہے اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور اس کا راستہ روکا جا سکتا ہے - لیکن اس رائے سے اختلاف کر رہے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ بھی - رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین - یہ اختلاف بھی معاذ اللہ بدنیتی پر نہیں تھا - وہ بھی یعنی حضرت حسینؓ بھی اور یہ یعنی تینوں عبادلہ بھی نیک نیت تھے - ان تینوں حضرات نے لاکھ سمجھایا کہ آپ کوفہ والوں پر ہرگز اعتماد نہ کیجئے - یہ لوگ قطعی بھروسے کے لائق نہیں ہیں - یہ لوگ جو کچھ آپکے والد بزرگوار کے ساتھ کرتے رہے ہیں، اس کو یاد کیجئے - جو کچھ آپ کے برادرِ محترم کے ساتھ کر چکے ہیں اس کو پیش نظر رکھیئے - یہ عین ممکن ہے کہ ان کے دل آپ کے ساتھ ہوں لیکن ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں نہیں اٹھیں گی بلکہ معمولی خوف یا دباؤ یا لالچ سے آپکے خلاف اٹھ جائیں گی - لیکن حضرت حسینؓ کا ایک فیصلہ ہے - جس پر وہ کمال استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں فرمانِ خداوندی اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر رہے ہیں یعنی "فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" یعنی پہلے خوب غور کر لو، سوچ لو، امکانات کا جائزہ لے لو، تدبیر کو بروئے کار لانا ضروری ہے - ساز و سامان کی فراہمی ضروری ہے -

یہ بھی دیکھو کہ صورتِ حال (SITUATION) فی الواقع درپیش ہے اس کے تقاضے پورا کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں - لیکن جب ان مراحل سے گزر کر ایک فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اقدام کرو - "فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ" یہ رہنمائی ہے - قرآن و سنّت میں - آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسین نے ASSESSMENT میں غلطی کی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کسی بدنیتی سے یا حکومت و اقتدار کی طلب میں یہ کام کیا - معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ - اہلِ سنّت کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے - میں ذاتی طور پر اس بات سے کھلم کھلا اور ہر عام اعلان برأت کرتا ہوں - اگر کسی کو یہ شک و شبہ یا غلط فہمی ہو کہ معاذ اللہ میری یہ رائے ہے کہ حضرت حسینؓ کے اس اقدام میں کوئی نفسانیت یا کوئی ذاتی غرض تھی تو میں اس سے بالکلیہ بری ہوں الحمد للہ ثم الحمد للہ - کسی کی یہ رائے اگر ہو تو ہو لیکن اچھی طرح جان لیجئے کہ اہل سنّت کے جو مجموعی اور مجمع علیہ عقائد ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت حسینؓ کے اقدام اور مشاجراتِ صحابہؓ کے ضمن میں کسی صحابیٔ رسولؐ پر بدنیتی اور نفسانیت کا حکم لگانے سے ایمان میں خلل واقع ہوگا - بلا تخصیص ہم تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو عدول مانتے ہیں - البتہ معصوم کسی کو نہیں مانتے اور ہر ایک سے خطاءِ اجتہادی کے احتمال و امکان کو تسلیم کرتے ہیں -

حضرت حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی نیک نیتی سے ایک رائے تھی - نیک نیتی ہی سے ایک اندازہ (ASSESSMENT) تھا اور جب اس پر انشراح ہو گیا تو دین ہی کے لئے عزیمت تھی - جب ولی عہدی کی بیعت کا مسئلہ مدینہ منورہ میں پیش ہوا تھا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وہاں سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے - حضرت حسینؓ نے بھی ایسا ہی کیا - چند حضرات کی رائے یہ تھی کہ مکہ مکرمہ ہی کو STRONG HOLD اور اصل BASE بنایا جائے اور اس ولی عہدی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا جائے - ابھی اس سلسلہ میں کوئی مؤثر کام شروع نہیں ہو سکا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کا انتقال ہو گیا اور بحیثیت ولی عہد حکومت امیر یزید کے ہاتھ میں آ گئی - جس کے بعد کوفہ والوں نے خطوط بھیج بھیج کر حضرت حسینؓ کو اپنی وفاداری اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جدوجہد اور اقدام کا

یقین دلایا - آں جنابؓ نے تحقیق حال کے لئے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا - ان کی طرف سے بھی اطلاعات یہی موصول ہوئیں کہ اہل کوفہ بدل وجان ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں - حضرت حسینؓ نے کوفہ کے سفر کا ارادہ کر لیا اور کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں - حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں نے بہت سمجھایا کہ مکہ سے نہ نکلیے - یہ دونوں حضرات یہ کہتے ہوئے رو پڑے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو ان کے گھر والوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا - اسی طرح آپ کے اہل وعیال کے سامنے آپ کو بھی ذبح کر دیا جائے - جب حضرت حسینؓ نے کوچ کیا ہے تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ان کی سواری کے ساتھ ڈورتے ہوئے دور تک گئے ہیں اور اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدا کے لئے باز آجایئے اور اگر جانا ہی ہے تو خواتین اور بچوں کو تو ساتھ لے کر نہ جایئے - اور یہ عبداللہ ابن عباسؓ کون ہیں ! رشتے میں ایک جانب سے حضرت حسینؓ کے چچا لگتے ہیں - تو دوسری طرف سے نانا - اس لئے کہ والد یعنی حضرت علیؓ کے بھی چچازاد بھائی ہیں اور نانا یعنی نبی اکرمؐ کے بھی چچازاد بھائی ہیں ! لیکن اس وقت محبت سے مغلوب ہو کر کہہ رہے ہیں "اے ابن عم! خدا کے لئے باز آجاؤ یا کم از کم ان عورتوں اور بچوں کو مکہ ہی میں چھوڑ جاؤ" - لیکن نہیں، دوسری جانب عزیمت کا ایک کوہ گراں ہے پیکر شجاعت ہے - سراپا استقامت ہے - نیک نیتی سے جو فیصلہ کیا ہے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں - اس کے بعد راستے میں جب اطلاع ملی کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ جو ایلچی اور تحقیق کنندہ کی حیثیت سے کوفہ گئے تھے - وہاں شہید کر دیئے گئے اور کوفہ والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی - سب کے سب نے گورنر کوفہ کے سامنے حکومت وقت کے ساتھ وفاداری کا عہد استوار کر لیا ہے تو حضرت حسینؓ نے سوچنا شروع کیا کہ سفر جاری رکھا جائے یا مکہ واپسی ہو - لیکن ذہن میں رکھئے کہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جو انسان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہوتا ہے - عرب کا مزاج یہ تھا کہ خون کا بدلہ لیا جائے خواہ اس میں خود اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں - چنانچہ حضرت مسلم کے عزیز رشتہ دار کھڑے ہو گئے کہ اب ہم ان کے خون کا بدلہ لئے بغیر واپس نہیں جائیں گے - حضرت حسینؓ کی شرافت اور مروت کا تقاضا تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہ چھوڑیں جو ان کے

مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے نکلے تھے - یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ مسلم بن عقیل کے خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے عزم کا اظہار کرنے والوں کا ساتھ یہ پیکرِ شرافت و مروت نہ دیتا - لہٰذا سفر جاری رہا - اسی دوران حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ جو چچازاد بھائی ہیں، ان کے بیٹے حضرت عون اور حضرت محمد ان کا پیغام لے کر آئے ہیں "کہ خدا کیلئے اُدھر مت جاؤ" - لیکن فیصلہ اٹل ہے - ان دونوں کو بھی ساتھ لیتے ہیں اور سفر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ قافلہ دشتِ کربلا میں پہنچ گیا - اُدھر کوفہ سے گورنر ابن زیاد کا لشکر آگیا - یہ لشکر ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کو صرف ایک حکم تھا کہ وہ حضرت حسینؓ کے سامنے یہ دو صورتیں پیش کرے کہ آپ کوفہ کی طرف جا سکتے ہیں نہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں - ان دونوں سمتوں کے علاوہ جدھر آپ جانا چاہیں اس کی اجازت ہے - یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ تیسرا راستہ کون سا ہو سکتا تھا! وہ راستہ تھا دمشق کا - لیکن افسوس کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اسے اختیار نہ کیا بلکہ آپؓ وہیں ڈٹے رہے - اب عمر بن سعد کی قیادت میں چار ہزار کا لشکر کوفہ مزید پہنچ گیا - اور یہ عمر بن سعد کون تھے ؟ افسوس کہ ان کے نام کو گالی بنا دیا گیا ہے - یہ تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران اور پہلے از عشرہ مبشرہ کے بیٹے - جن کی حضرت حسینؓ کے ساتھ قرابت داری بھی ہے - وہ بھی مصالحت کی انتہائی کوشش کرتے ہیں - اور گفت و شنید جاری رہتی ہے - اب حضرت حسینؓ کی طرف سے تین صورتیں پیش ہوتی ہیں - یعنی یہ کہ "یا مجھے مکہ مکرمہ واپس جانے دو - یا مجھے اسلامی سرحدوں کی طرف جانے دو تاکہ میں کفار کے خلاف جہاد و قتال میں اپنی زندگی گذار دوں - یا میرا راستہ چھوڑ دو - میں دمشق چلا جاؤں - میں یزید سے اپنا معاملہ خود طے کر لوں گا" لیکن اب گھیرا تنگ ہو گیا ہے - اور صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے - اور یہ بھی خوب جان لیجئے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے ؟ حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں ابن زیاد کے بھیجے ہوئے لشکروں کے سامنے جو خطبات دیئے - اس میں انہوں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ میرے پاس کوفیوں کے خطوط موجود ہیں جنہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی - انہوں نے اس کوفی فوج کے بہت سے سرداروں کے نام لے لے کر فرمایا:

"اے فلاں ابن فلاں! یہ تمہارے خط ہیں کہ نہیں جس میں تم نے مجھ سے بیعت کرنے کے لئے مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی تھی، جس پر وہ لوگ برأت کرنے لگے کہ نہیں ہم نے یہ خطوط نہیں بھیجے - اب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی چونکہ مصالحت کی صورت میں حکومتِ وقت سے ان کی غدّاری کا جرم ثابت ہوجاتا - جنگِ جمل اور جنگ صفّین کے واقعات یاد کیجئے - جہاں بھی مصالحت کی بات ہوگی، وہاں وہی سبائی فتنہ آڑے آئے گا جو اس سارے انتشار و افتراق اور خانہ جنگیوں کا بانی مبانی رہا ہے۔ مصالحت کی صورت میں تو ان کا کچّا چٹھّا کھل جاتا اور معلوم ہوجاتا کہ دوستی کے پردوں میں رہ کر کون دشمنی کرتا رہا ہے اور وہ کون ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکا دے کر اور خواص کو بہلا پھُسلا کر مسلمان کو مسلمان کے خلاف محاذ آرا کرتے آرہے ہیں۔ حضرت حسینؓ کے پاس کوفیوں کے بوریاں بھرے خطوط تھے مفاہمت کی صورت میں جب یہ سامنے آتے تو ان کا حشر کیا ہوتا - اس کو اچھی طرح آج بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سرداروں اور ان کے حواریوں نے مصالحت و مفاہمت کا سلسلہ جاری رہنے نہیں دیا اور عمرؓ بن سعد کو مجبور کردیا کہ وہ حضرت حسینؓ کے سامنے یہ شرط پیش کرے کہ یا تو غیر مشروط پر SURRENDER کیجئے - ورنہ جنگ کیجئے - یہ سازشی لوگ حضرت حسینؓ کے مزاج سے اتنے ضرور واقف تھے کہ ان کی غیرت و حمیّت غیر مشروط طور پر حوالگی کے لئے تیار نہیں ہوگی اور فی الواقع ہوا بھی یہی - یہاں یہ جان لیجئے کہ معاملہ تھا حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالےٰ عنہما کا آن کی غیرت، ان کی حمیّت ان کی شجاعت اس توہین و تذلیل کو ہرگز گوارا نہ کرسکتی تھی - لہٰذا انہوں نے غیر مشروط SURRENDER کرنے سے انکار کردیا اور مسلّح تصادم ہوکر رہا۔ جس کے نتیجے میں سانحہ کربلا واقع ہوا - داد شجاعت دیتے ہوئے آپؓ کے ساتھی شہید ہوئے - آپؓ کے اعزّہ اقارب نے اپنی جانیں نچھاور کیں اور آپؓ نے بھی تلوار چلاتے ہوئے اور دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ - یہ ہے اصل حقیقت اس سانحہ فاجعہ کی۔ اصل سازشی ذہن کو پہچانئے - جیسے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے درمیان اختلاف کا افسانہ جس نے بھی تراشا ہے بڑی عیارانہ مہارت سے تراشا اور

گھڑا ہے - اس افسانے سے حقائق گم کر دیئے گئے ہیں - اب ہوتا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اصل مجرم کو PIN POINT کیا جائے - کوئی حضرت عثمانؓ کو تنقید کا ہدف بناتا ہے تو کوئی حضرت علیؓ کو - اس طرح یہ دونوں فریق ان سازشی سبائیوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں - اس لئے کہ حضرت عثمانؓ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کا کام بنتا ہے اور حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کے پو بارہ ہوتے ہیں - یہ عثمانؓ کون ہیں؟ یہ ہیں ذوالنورین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد اور یکے از عشرہ مبشرہ - اور یہ علیؓ کون ہیں؟ آں حضورؐ کے تربیت یافتہ آپؐ کے چچازاد بھائی - آپؐ کے داماد - آپؐ کے محبوب اور یکے از عشرہ مبشرہ - ان دونوں میں سے کسی کی بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو اس کی زد پڑتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر - جو ان دونوں کے مزکّی و مربّی تھے - ان شخصیتوں میں اگر نقص اور عیب مانا جائے گا تو محمد رسول اللہؐ کی تربیت پر حرف آئے گا اور آں حضرتؐ کی شخصیتِ مبارکہ مجروح ہوگی - افسوس کہ آج بھی اُن سبائیوں کا کام دونوں طرف سے بن رہا ہے - خوب جان لیجئے کہ ایسے تمام لوگ چاہے وہ اس کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، سبائی ایجنٹ ہیں - ہمارا موقف یہ ہے کہ "الصحابۃ کلّھم عدول" کوئی بدنیتی اور نفسانیت نہ حضرت عثمان میں تھی نہ حضرت علی میں، نہ حضرت معاویہ میں تھی نہ حضرت مغیرہ بن شعبہ میں نہ حضرت عمرو بن العاص میں تھی نہ حضرت ابوموسیٰ اشعری میں نہ حضرت حسین ابن علی میں تھی نہ حضرت عبداللہ ابن عباس یا عبداللہ ابن عمر میں رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین - ہاں ایک فتنہ تھا جس نے ہر مرحلہ پر جب بھی مصالحت و مفاہمت کی صورت پیدا ہوتی نظر آئی اس کو تار تار پیڈ کیا اور اس کے بجائے ایسی نازک صورتِ حال (CRITICAL SITUATION) پیدا کر دی کہ کشت و خون ہو - مسلمان ایک دوسرے کی گردنوں پر تلواریں چلائیں اور فتنہ اور بھڑکے اور حق کے سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے - اور یہ "رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا" والی صورت ختم ہو سکے - چنانچہ کون انصاف پسند ایسا ہوگا جو نہ جانتا ہو کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی

کی مظلومانہ شہادت سے لے کر کربلا کے سانحۂ فاجعہ تک مسلمانوں کی آپس میں جو مسلح آویزش رہی ہے اس میں در پردہ ان سبائیوں ہی کا ہاتھ تھا۔ مستند تواریخ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ البتہ ان کو نگاہِ حقیقت بین اور انصاف پسندی کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔ آنجنابؓ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بالکل وہی جو ایک بیٹے کو ماں کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ چالیس خواتین اور حضرت صدیقہؓ کے لشکر کے معتبر ترین لوگوں کے ہمراہ پورے ادب و احترام کے ساتھ انؓ کو مدینہ منوّرہ پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ نہ ذاتی دشمنی تھی نہ بغض و عناد۔ اور ادھر کیا ہوا! معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ کیا امیر یزید نے خاندان رسالت کی خواتین کو اپنی لونڈیاں بنایا؟ آخر وہ دمشق بھیجی گئی تھیں، لیکن وہاں کیا ہوا! ان کا پورا احترام کیا گیا، ان کی دلجوئی کی گئی، ان کی خاطر مدارات کی گئی۔ امیر یزید نے انتہائی تأسف کا اظہار کیا اور کہا کہ "ابن زیاد اس حد تک نہ بھی جاتا تو بھی میں اس سے راضی رہ سکتا تھا۔ کاش وہ حسینؓ کو میرے پاس آنے دیتا ہم خود ہی باہم کوئی فیصلہ کر لیتے"۔ لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا وہ اس فتنے کی وجہ سے ہوا جو کوفیوں نے بھڑکایا تھا۔ جو اپنی دوعملی اور منافقت کی پردہ پوشی کے لئے نہیں چاہتے تھے کہ مصالحت و مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ان کو جب محسوس ہوا کہ ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا تو انہوں نے وہ صورتِ حال پیدا کر دی جو ایک نہایت دردناک اور الم انگیز انجام پر منتج ہوئی۔

یہ سانحۂ فاجعہ انتہائی افسوس ناک تھا۔ اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے! اس نے تاریخ پر جو گہرے اثر ڈالے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں اس کے کڑوے اور کسیلے پھل کا مزا امت چودہ سو سال سے چکھتی چلی آ رہی ہے۔ ان دو واقعات یعنی شہادتِ حضرت عثمانؓ اور شہادت حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وجہ سے ہمارے درمیان افتراق، انتشار اور اختلاف اور باہمی دست و گریباں ہونے کی جو فضا چلی آ رہی ہے۔ اس پر ان لوگوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلتے ہیں جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی۔ جہاں جہاں اس کے اثرات پہنچے

درحقیقت کامیابی ہوئی ہے ان کو جو دراصل ان فتنوں کی آگ کو بھڑکانے والے تھے - اب کوئی یزید کے نام کو گالی بنائے پھرتا ہے - کسی نے شمر کے نام کو گالی بنایا ہوا ہے - کوئی عمر بن سعد کے نام کو گالی بنائے ہوئے ہے - یہاں تک بات پہنچی ہے کہ لوگ حضرت امیر معاویہؓ کے شان میں بھی توہین آمیز اور گستاخانہ انداز اختیار کرنے سے نہیں چوکتے - اللہ تعالیٰ ایسے سب لوگوں کو ہدایت دے اور ہمیں ان میں شامل ہونے سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے - اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کو ہمیشہ مدنظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے کہ

"اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ . . . ."

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

بقیہ عرض احوال

کافی حضرات نے ان نشستوں میں شرکت کی - حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی تقاریر جہاں معلومات کے لحاظ سے علم کا ایک خزانہ تھیں وہاں ان کے انداز خطاب میں بلا کی تاثیر تھی - مولانا موصوف کی قرآن اکیڈمی میں تشریف آوری اس تربیت گاہ میں روحانی فضا کو مزید جلا عطا کرنے کا سبب بنی -

اس تربیت گاہ میں تنظیم اسلامی لاہور کے رفقا کے علاوہ، ملک کے دوسرے شہروں سے بھی کافی تعداد میں رفقائے تنظیم اور مبصرین نے شرکت کی اور افادیت اور شرکاء کی تعداد کے لحاظ سے یہ تربیت گاہ کافی کامیاب رہی - الحمد للہ والمنہ -

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ: (الحدیث)
تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دروسِ قرآن اور خطابات پر مشتمل

نشر القرآن کیسٹ سیریز

نمبر شمار	موضوع	کوڈ نمبر	قیمت روپے
۱	سیرت النبیؐ ۱۰ تقاریر کا سیٹ (۹۰-سی کے گیارہ کیسٹ)	۱۱ - ۱	۳۳۰/-
۲	نظریۂ ارتقاء اور قرآن حکیم (۹۰ سی)	۱۲	۳۰/-
۳	حقیقتِ انسان اور حقیقتِ روحِ انسانی (۶۰-سی دو کیسٹ)	۱۴-۱۳	۵۰/-
۴	نیکی کا حقیقی تصور (۹۰ سی)	۱۵	۳۰/-
۵	عظمت قرآن حکیم (۹۰ سی)	۱۶	۳۰/-
۶	تاریخ اُمّت مسلمہ (بموقع یوم اقبال) (۶۰-سی)	۱۷	۲۵/-
۷	قرآن کا تصورِ حیاتِ انسانی (۶۰ - سی)	۱۸	۲۵/-
۸	تنظیم کی اہمیت اُسوۂ محمدی کی روشنی میں (۶۰ - سی)	۱۹	۲۵/-
۹	پردہ کے احکام (سورۃ احزاب کی روشنی میں (۹۰-سی)	۲۰	۳۰/-
۱۰	اسلام کا معاشی نظام (۶۰-سی دو کیسٹ)	۲۲-۲۱	۵۰/-
۱۱	سیرتِ مطہرہ کا پیغام (۱۲ ربیع الاوّل) (۶۰-سی، ۹۰-سی)	۲۴-۲۳	۵۵/-
۱۲	تفسیر آیۂ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۶۰ - سی)	۲۵	۲۵/-
۱۳	سورۃ الفاتحہ (۶۰ - سی دو کیسٹ)	۲۷-۲۶	۵۰/-

قیمت روپے	کوڈ نمبر	موضوع	نمبر شمار
۱۰۰ / -	۲۸-۳۱	درس سورۃ بقرہ (پہلے دو رکوع) (۶۰-سی چار کیسٹ)	۱۴
۵۵ / -	۳۲-۳۳	خلافت راشدہ کی شرعی اور تاریخی حیثیت ۶۰/۹۰سی دو کیسٹ	۱۵
۶۰ / -	۳۴-۳۵	درس سورۃ الحج (آخری رکوع) ۹۰ سی دو کیسٹ	۱۶
۱۰۰ / -	۳۶-۳۹	درس سورۃ بقرہ (دوسرا تیسرا رکوع) ۶۰-سی چار کیسٹ	۱۷
۵۰ / -	۴۰-۴۱	شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر (۶۰-سی دو کیسٹ)	۱۸
۲۱۰ / -	۴۲-۴۸	سورۃ الشوریٰ مکمل مصری قرآت (۹۰-سی سات کیسٹ)	۱۹
۹۰ / -	۴۹-۵۱	سورۃ الحجرات (مکمل)، (۹۰-سی تین کیسٹ)	۲۰
۶۰ / -	۵۲-۵۳	درس قرآن سورۃ صف والجمعہ (۹۰-سی دو کیسٹ)	۲۱
۶۰ / -	۵۴-۵۵	سیرت نبویؐ کا عملی پہلو (۹۰-سی دو کیسٹ)	۲۲
۱۵۰ / -	۵۶-۶۰	سورۃ مریم (مکمل) (۹۰-سی پانچ کیسٹ)	۲۳
۶۰ / -	۶۱-۶۲	سورۃ المنافقون (۹۰-سی دو کیسٹ)	۲۴
۲۵ / -	۶۳	خطاب بموقع تقریب نکاح مسنونہ (۶۰-سی)	۲۵
۳۰ / -	۶۴	قرآن کا فلسفۂ شہادت (۹۰-سی)	۲۶
۲۵ / -	۶۵	خطاب جمعہ (تاریخ اُمتِ مسلمہ (۶۰-سی)	۲۷

نوٹ: قرآن حکیم کا منتخب نصاب زیر ریکارڈنگ ہے • تمام کیسٹ جاپان سے درآمد شدہ استعمال کئے گئے ہیں • کاروباری حضرات مزید تفصیلات کے لئے رجوع فرمائیں • خرچہ ڈاک (رجسٹرڈ پارسل) بذمہ خریدار ہوگا • بذریعہ ڈاک طلب فرمانے والے حضرات آرڈر کے ساتھ کوڈ نمبر کا حوالہ ضرور دیں نیز رقم پیشگی ارسال فرمائیں • بذریعہ وی-پی طلب فرمانے والے حضرات نصف رقم پیشگی ارسال فرمائیں

نشر القرآن، کیسٹ سیریز لاہور ۱۴

تنظیم اسلامی ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون ۸۵۲۴۱۱ ۸۵۲۶۸۳

کربلا کی کہانی

حضرت ابوجعفرؒ کی زبانی

از قلم:- جناب مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب

روایت کے راوی عمار دہنی نے کہا کہ میں نے محمد بن علی بن الحسینؓ سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے واقعۂ قتل حسینؓ ایسے انداز سے بیان فرمائیں کہ گویا میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سامنے ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت محمد باقرؒ نے فرمایا، امیر معاویہؓ کے انتقال کے وقت ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت معاویہؓ کا بھتیجا یزید کا چچیرا بھائی مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ ولید نے حسبِ دستور حضرت حسینؓ کو پیغام بھیجا تاکہ ان سے نئے امیر یزید کے لیے بیعت لیں۔ حضرت حسینؓ نے جواب میں فرمایا کہ سردست آپ سوچنے کی مہلت دیں اور اس بارے میں نرمی اختیار کریں۔ ولید نے ان کو مہلت دے دی۔ حضرت حسینؓ مہلت پاکر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء جب کوفہ والوں کو اس کا پتہ چلا کہ حضرتؓ تو مکہ شریف پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے اپنے تا صد حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں روانہ کیے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں، ہم اب آپ ہی کے ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ یزید کی بیعت سے منحرف ہیں۔ ہم نے گورنرِ کوفہ کے پیچھے جمعہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت نعمان بن بشیر انصاریؓ یزید کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب اہلِ کوفہ کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں آئیں۔ تو حضرت حسینؓ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تاکہ وہ کوفہ جائیں اور وہاں جاکر صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ اگر اہلِ کوفہ کے بیانات صحیح ہوئے تو خود بھی کوفہ پہنچ جائیں گے۔

حضرت مسلم کی کوفہ کو روانگی

قرارداد کے مطابق حضرت مسلم مکہ شریف سے مدینہ منورہ پہنچے وہاں سے

راستہ کی راہنمائی کے لیے دو آدمی ساتھ لیے اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس راستہ سے وہ لے گئے اس میں ایک ایسا لق و دق میدان آ گیا جس میں پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے سخت دوچار ہو گئے۔ چنانچہ اسی جگہ ایک رہنما انتقال کر گیا۔ اس صورتِ حال کے پیش آنے پر حضرت مسلم نے حضرت حسینؓ کو ایک خط لکھ کر کوفہ جانے سے معذرت چاہی لیکن حضرت ممدوحؓ نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ ضرور کوفہ جائیں۔ بنابریں حضرت مسلم کوفہ کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص عوسجہ نامی کے گھر قیام فرمایا جب اہلِ کوفہ میں حضرت مسلم کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو وہ خفیہ طور پر ان کے ہاں آئے اور ان کے ہاتھ پر حضرت حسینؓ کے لیے بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ بارہ ہزار اشخاص نے بیعت کر لی۔ دریں اثنا یزید کے ایک کارندہ عبداللہ بن مسلم بن شعبہ حضرمی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ساری کارروائی کی اطلاع نعمان بن بشیر گورنرِ کوفہ کو دے دی اور ساتھ ہی کہا یا تو آپ واقعتہً کمزور ہیں یا کوفہ والوں نے آپ کو کمزور سمجھ رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ شہر کی صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے؟ اس پر حضرت نعمان نے فرمایا کہ میری ایسی کمزوری جو بر بنائے اطاعتِ الٰہی ہو وہ مجھے اس قوت و طاقت سے زیادہ پسند ہے۔ جو اس کی معصیت میں ہو، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جس امر پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالے رکھا ہے خواہ مخواہ اس پردہ کو فاش کروں۔ اس پر عبداللہ مذکور نے یہ سارا ماجرا یزید کو لکھ کر بھیج دیا۔ یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سرجون نامی سے اس بارے میں مشورہ لیا۔ اس نے کہا، اگر آپ کے والد زندہ ہوتے اور آپ کو کوئی مشورہ دیتے تو اسے قبول کرتے؟ یزید نے کہا ضرور! سرجون نے کہا تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوفہ کی گورنری عبیداللہ بن زیاد کے سپرد کریں۔ ادھر صورتِ حال ایسی تھی کہ ان دنوں یزید عبیداللہ مذکور پر ناراض تھا۔ اور بصرہ کی گورنری سے بھی اس کو معزول کرنا چاہتا تھا۔ مگر سرجون کے مشورے پر اس نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری پر بھی عبیداللہ بن زیاد کو نامزد کر دیا اور لکھ دیا کہ کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو تلاش کرو

اگر مل جائے تو اس کو قتل کردو۔

ابن زیاد کوفہ میں اور افشائے راز

اس حکم کی بنا پر عبیداللہ بصرہ کے چند سرکردہ لوگوں کے ہمراہ اس حالت میں کوفہ پہنچا کہ اس نے ڈھانٹا باندھ رکھا تھا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔ وہ اہل کوفہ کی جس مجلس سے گزرتا ان پر سلام کہتا اور وہ حضرت حسینؓ سمجھ کر وعلیک السلام یا ابن رسول اللہ اے رسول اللہ کے بیٹے آپ پر بھی سلام سے جواب دیتے۔ اسی طرح سلام کہتا اور جواب لیتا ہوا وہ قصر امارت میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک غلام کو تین ہزار درہم دیئے اور کہا کہ تم جاکر اس شخص کا پتہ لگاؤ جو کوفہ والوں سے بیعت لیتا ہے۔ لیکن دیکھو تم خود کو "حمص" کا باشندہ ظاہر کرنا اور یہ کہنا کہ میں بیعت کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ رقم بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے مشن کی تکمیل میں اس کو صرف کریں۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور بہ لطائف الحیل اس شخص تک اس کی رسائی ہوگئی جو بیعت لینے کا اہتمام کرتا تھا۔ اور اس نے اپنے آنے اور امدادی رقم پیش کرنے کی سب بات کہہ ڈالی۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تمہیں ہدایت کا راستہ نصیب ہوا لیکن یہ محسوس کرکے دکھ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری اسکیم ابھی پختہ نہیں ہوئی۔ تاہم وہ اس غلام کو حضرت مسلم بن عقیل کے ہاں لے گیا۔ حضرت مسلم نے اس سے بیعت بھی لے لی اور رقم بھی اس سے قبول کرلی۔ اب وہ یہاں سے نکلا اور عبیداللہ بن زیاد کے پاس سیدھا پہنچا اور سب کچھ اس کو بتلا دیا۔ ادھر حضرت مسلم عبیداللہ کی کوفہ میں آمد کے بعد عوسجہ کا گھر چھوڑ کر ہانی بن عروہ مرادی کے مکان پر فروکش تھے اور حضرت حسینؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ بارہ ہزار کی تعداد میں ہماری لوگوں نے بیعت کرلی ہے آپ کوفہ تشریف لے آئیں۔

اور یہاں یہ ہوا کہ جب عبیداللہ کو پتہ چل گیا کہ مسلم ہانی کے مکان پر ہیں تو اس نے کوفہ کے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ کیا بات ہے ہانی میرے پاس نہیں آئے؟ اس پر حاضرین سے ایک شخص محمد بن اشعث چند ہمراہیوں کے ساتھ ہانی کے ہاں گئے

تو وہ اپنے دروازے پر موجود تھے۔ ابن اشعث نے کہا کہ گورنر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ اور آپ کے اب تک نہ حاضر ہونے کو بہت محسوس کرتے ہیں، لہٰذا آپ کو چلنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے زور دینے پر ہانی ان کے ساتھ ہو لیے اور وہ عبید اللہ کے پاس پہنچے اور اتفاق سے اس وقت قاضی شریح بھی ابن زیاد کے پاس موجود تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا دیکھو اس ہانی کی چال کھوٹ کی مظہر ہے۔ پھر اتنے میں وہ اس کے پاس آ گیا تو کہا" ہانی! مسلم بن عقیل کہاں ہیں؟ اس نے کہا مجھے علم نہیں، اس پر عبید اللہ نے تین ہزار روپے والے غلام کو اس کے سامنے کر دیا، ہانی بالکل لاجواب ہو گئے، البتہ اتنا کہا کہ میں نے انہیں اپنے گھر بلایا نہیں بلکہ وہ خود میرے گھر آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ ابن زیاد نے کہا اچھا ان کو حاضر کرو۔ اس پر پس و پیش کیا تو ابن زیاد نے انکو اپنے قریب منگا کر اس کے زور سے چھڑی ماری جس سے اس کی بھویں پھٹ گئیں۔ اس پر ہانی نے اس کے ایک محافظ سپاہی سے تلوار چھین کر عبید اللہ پر وار کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر ابن زیاد نے یہ کہہ کر کہ اب تمہارا خون حلال ہے قصرِ امارت کے ایک حصے میں اس کو قید میں ڈال دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع ہانی کے قبیلہ مذحج کو ہوئی تو انہوں نے قصرِ امارت پر یلغار بول دی۔ عبید اللہ نے شور سنا اور پوچھا تو کہا گیا ہانی کا قبیلہ ان کو چھڑانے کے لیے چڑھ آیا ہے۔ اس نے قاضی شریح کے ذریعے ان کو کہلایا کہ ہانی کو مسلم بن عقیل کا پتہ کرنے اور بعض باتوں کی تحقیق کے لیے روک لیا گیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ساتھ ہی قاضی شریح پر بھی ایک غلام کو لگا دیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں؟ قاضی شریح لوگوں کی طرف جاتے ہوئے ہانی کے پاس سے گزرے تو اس نے قاضی صاحب سے کہا کہ میرے بارے میں اللہ سے ڈرنا، ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ تاہم قاضی شریح نے ہجوم کو ابن زیاد والی بات کہہ کر مطمئن کر دیا، اور لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

حضرت مسلم کو جب ہنگامہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ذرائع ابلاغ

سے کوفہ میں اعلان کرا دیا جس کے نتیجہ میں چالیس ہزار لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ جس کو باقاعدہ انہوں نے ایک فوجی دستہ کی شکل دے دی جس کا مقدمۃ الجیش میمنہ اور میسرہ وغیرہ بھی کچھ تھا۔ خود حضرت مسلم بن عقیل اس کے قلب میں ہو گئے اس طرح چالیس ہزار کا یہ لشکر جرار قصر امارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبید اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہالیان اہل کوفہ کو اپنے قصر میں بلایا۔ جب یہ لشکر قصر امارت تک پہنچ گیا تو سرداران کوفہ نے اپنے اپنے قبیلے کو دیواروں کے اوپر سے گفتگو کر کے سمجھانا شروع کیا۔ اب تو مسلم کی فوج کے آدمی کھسکنے شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے شام تک صرف پانچ سو رہ گئے۔ حتیٰ کہ رات کے اندھیرے تک وہ بھی چل دیئے۔ جب حضرت مسلم نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں ایک مکان کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خاتون اندر سے آپ کی طرف نکلی تو آپ نے اس کو پانی پلانے کے لیے کہا تو اس نے پانی تو پلا دیا لیکن اندر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر باہر آئی تو آپ کو دروازے پر دیکھ کر اس نے کہا اے اللہ کے بندے! آپ کا اس طرح بیٹھنا مشکوک ہے یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے کہا میں مسلم بن عقیل ہوں، کیا تم مجھے پناہ دو گی۔ اس نے کہا ہاں آجایئے۔ آپ اندر چلے گئے۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس عورت کے لڑکے نے محمد بن اشعث مذکور کو اطلاع دے دی جس نے فوراً عبید اللہ تک خبر پہنچائی۔ جس نے اس کے ہمراہ پولیس کو روانہ کر دیا اور ان کو مسلم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ پولیس نے جا کر مکان کا محاصرہ کر لیا جب کہ مسلم کو خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ اب خود کو انہوں نے محصور پایا تو تلوار سونت کر نکل آئے اور پولیس مقابلہ کی ٹھان لی۔ لیکن ابن اشعث نے ان کو روک کر کہا کہ میں ذمہ دار ہوں آپ محفوظ رہیں گے۔ پس وہ حضرت مسلم کو ابن زیاد کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ چنانچہ ابن زیاد کے حکم سے قصر امارت کی چھت پر لے جا کر قتل کر دیا گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان کی لاش بازار میں لوگوں کے سامنے پھینک دی گئی۔ نیز اس کے حکم سے ہانی کو کوڑے کرکٹ کی جگہ تک گھسیٹتے ہوئے لے جا کر سولی دے دی گئی ادھر تو کوفہ میں یہ تک ہو گیا تھا اور ——————

حضرت حسینؓ کی کوفہ روانگی

اُدھر حضرت مسلم چونکہ خط لکھ چکے تھے کہ بارہ ہزار اہلِ کوفہ نے بیعت کر لی ہے حضرت حسینؓ جلد از جلد تشریف لے آئیں۔ حضرت حسینؓ مکہ شریف سے کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تا آنکہ آپ قادسیہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھے کہ حُر بن یزید تمیمی حضرت حسینؓ کے قافلہ کو ملا۔ اس نے کہا کہاں تشریف لے جا رہے ہو آپ نے فرمایا کوفہ، اس نے کہا کہ وہاں تو کسی خیر کی توقع نہیں آپ کو یہاں سے ہی واپس ہو جانا چاہیئے۔ پھر کوفیوں کی بے وفائی اور حضرت مسلم کے قتل کی پوری روداد آپ کو سنائی۔

سارا قصہ سن کر حضرت حسینؓ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن مسلم کے بھائیوں نے نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا کہ ہم مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود بھی مارے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسینؓ نے فرمایا تمہارے بغیر میں جی کر کیا کروں گا۔ اب وہ سب کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کو ابن زیاد کی فوج کا ہراول دستہ نظر آیا تو آپ نے "کربلا" کا رُخ کر لیا۔ اور وہاں جا کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں ایک ہی طرف سے جنگ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ خیمے نصب کر لیے۔ اس وقت آپ کے ساتھ پنتالیسؐ سوار اور سَوؐ کے قریب پیدل تھے۔

دریں اثنا عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو جو کوفے کا گورنر تھا بلایا اور اس سے کہا کہ اس شخص کے معاملے میں میری مدد کریں اس نے کہا مجھے تو معاف ہی رکھیے ابنِ زیاد نہ مانا۔ اس پر عمرو بن سعد نے کہا پھر ایک شب سوچنے کی مہلت تو دے دیجئے اس نے کہا ٹھیک ہے سوچ لو۔ ابن سعد نے رات بھر سوچنے کے بعد آمادگی کی اطلاع دے دی۔

اب عمرو بن سعد حضرت حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دیکھو تین باتوں میں سے ایک بات منظور کر لو (۱) یا تو مجھے کسی اسلامی سرحد پر چلے جانے دو (۲) یا مجھے موقعہ دو کہ میں براہِ راست یزید کے پاس پہنچ جاؤں (۳) اور یا پھر یہ کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

ابن سعد نے یہ تجویز خود منظور کر کے ابن زیاد کو بھیج دی۔ اس نے لکھا ہیں

یہ منظور نہیں ہے (بس ایک ہی بات ہے کہ) حسینؓ (یزید کے لیے) میری بیعت کریں۔ ابن اسعد نے یہی بات حضرت حسینؓ تک پہنچا دی۔ انہوں نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور حضرت کے سب ساتھی (مظلومانہ) شہید ہو گئے جن میں دس سے کچھ اوپر نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ اسی اثنا میں ایک تیر آیا جو حضرت کے ایک چھوٹے بچے کو لگا جو گود میں تھا۔ آپ اس سے خون پونچھ رہے تھے اور فرما رہے تھے "اے اللہ! ہمارے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فیصلہ فرما۔ جنہوں نے پہلے یہ لکھ کر ہمیں بلایا ہے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے۔ پھر اب وہی ہمیں قتل کر رہے ہیں۔" اس کے بعد خود تلوار ہاتھ میں لی، مردانہ وار مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے! رضی اللہ عنہ، اور یہ شخص جس کے ہاتھ سے حسینؓ شہید ہوئے قبیلہ مذحج کا آدمی تھا، اگرچہ اس بارے میں دوسرے اقوال بھی تاریخوں میں مذکور ہیں۔

مذحج ہانی کا وہی قبیلہ تھا، جس نے قصرِ امارت پر چڑھائی کر دی تھی۔ یہ شخص حضرت کا سر تن سے جدا کر کے ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ اس نے اس شخص کو آپ کا سر مبارک دے کر یزید کے پاس بھیج دیا۔ جہاں جا کر یزید کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ادھر ابن سعد بھی حضرت کے گھر دار کو لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا اور ان کا صرف ایک لڑکا بچا رہ گیا تھا اور وہ بچہ علی بن الحسین زین العابدین تھے اور روایت کے راوی ابو جعفر، الباقر کے والد تھے۔ یہ عورتوں کے ساتھ اور بیمار تھے۔ ابن زیاد نے حکم دیا، اس بچے کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس پر ان کی پھوپھی زینبؓ بنت علیؓ اس کے اوپر گر پڑیں، اور فرمایا کہ جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں گی اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں ابن زیاد نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا اور بعد اسیرانِ جنگ کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

جب حضرت حسینؓ کے بچے کھچے یہ افرادِ خانہ یزید کے دربار میں پہنچے تو چند درباریوں نے حسبِ دستور یزید تہنیتِ فتح پیش کی۔ ان میں سے ایک شخص نے یہاں تک جسارت کر ڈالی کہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا، امیر المومنین! یہ مجھے دے دیجیے۔" یہ سن کر حضرت زینب بن علیؓ نے کہا بخدا! یہ نہیں ہو سکتا، بجز اس

بقیہ صـ ۶۳

نشر القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ۲ نشری تقاریر

(سورۃ ھود آیات ۱۱۶ تا ۱۲۳)

(۱)

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَــَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝

سورہ ہود کی آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹ کا ترجمہ یہ ہے۔

"تو افسوس کہ نہ ہوئے تم سے پہلے کی اُمتوں میں صاحب خیر و شعور لوگ جو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے ہیں سوائے تھوڑے سے لوگوں کے جنہیں اُن میں سے ہم نے بچا لیا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی تو وہ اُسی عیش کے پیچھے پڑے رہے جس کا ساز و سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیدیا گیا تھا اور مجرم تو وہ تھے ہی! اور تیرا ربّ ہرگز ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے درآں حالیکہ ان کے باسی اصلاح کے لئے کوشاں ہوں۔ اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے پر عامل بنا دیتا (لیکن اس نے یہ جبر نہیں کیا) تو وہ اختلاف تو کرتے ہی رہیں گے۔ سوائے ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہو، اور اسی لئے تو اُس نے ان کو پیدا فرمایا تھا اور (اسطرح) تیرے ربّ کی وہ بات پوری ہو کر رہی کہ میں جہنّم کو جنّوں اور انسانوں سب سے بھر کر رہوں گا!" ترجمہ ختم ہوا —

قرآن حکیم کی دوسری متعدد مکّی سورتوں کی طرح سورۂ ہود میں بھی عرب اور اس کے گرد و نواح کی ان چھ اقوام کی ہلاکت کا ذکر آیا ہے جن کی جانب اولوالعزم رسول بھیجے گئے لیکن انہوں نے ان کی دعوتِ اصلاح پر کان نہ دھرے اور کفر و اعراض کی روش پر اصرار کیا۔ یعنی قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ اور آلِ فرعون اس پر ایک سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، اللہ تعالےٰ کوئی اذیت پسند (SADIST) ہستی ہے جسے ہلاکت اور بربادی و تباہی سے خوشی حاصل ہوتی ہے؟ — یا یہ لوگوں کے اپنے طرزِ عمل کا نتیجہ اور ان کے اپنے جرائم کی سزا تھی؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو کیا واقعی نیکی یا بدی کی راہ اختیار کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے؟ کیا اللہ تعالےٰ سب کو ایک ہی راہِ صواب پر ڈال سکتا تھا؟ اور اگر اُس نے نیکی اور بدی کا اختیار انسان کو دیا ہے تو پھر اس ضمن میں وہ کونسی حد ہے کہ جس تک کوئی انسانی معاشرہ پہنچ جائے تو اسے مزید مہلت نہیں ملتی اور اسے عذابِ استیصال یا عذابِ ہلاکت کا نوالہ بنا دیا جاتا ہے؟؟ —

چنانچہ ان ہی سوالات کے جوابات ہیں جو سورہ کے آخر میں آیات ۱۱۶ تا ۱۱۹ میں دیئے گئے ہیں: قرآن حکیم میں ترتیبِ بیان اس فطری و منطقی اعتبار سے ہے کہ اقوام معذّبہ کے ذکر کے فوراً بعد اس سوال کا جواب دیا گیا کہ یہ اس انجام سے کیوں دوچار ہوئیں اور پھر اصولی بحث کو چھیڑا گیا — لیکن ہم اگر بفرضِ تفہیم عکسی ترتیب اختیار کریں تو بہتر رہے گا۔ چنانچہ آیت ۱۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے:۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً "یعنی "اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی راہ پر مستقیم کر دیتا اور ظاہر ہے کہ یہ راہ نیکی اور خیر ہی کی ہوتی۔ اللہ کو یقیناً اس کی قدرت حاصل ہے اگر وہ جبر کے ذریعے لوگوں کو سیدھی راہ پر ڈالنا چاہتا تو نہ کوئی گمراہ ہو سکتا تھا نہ کجرَو اور نہ کسی کفر کا امکان رہتا نہ شرک کا۔ نہ نبیوں کی ضرورت رہتی نہ رسولوں کی اور نہ کسی عذابِ دنیوی کا سوال رہتا نہ کسی سزائے اُخروی کا! — لیکن اللہ نے ایسا نہ چاہا۔ اس کی حکمتِ تخلیق بالکل دُوسری ہے اُس نے جنّوں اور انسانوں کو اختیار اور ارادے کی آزادی بخشی ہے کہ سورہ دھر میں

وارد شدہ الفاظ "اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا" کی رُو سے شکر کی روش اختیار کریں یا کفرانِ نعمت کی اور سورہ کہف میں وارد شدہ الفاظ مبارکہ "فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ" کی رُو سے جو چاہے ایمان کی راہ اختیار کرے اور جو چاہے کفر کی روش اختیار کرلے ۔ اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ وہ ہے جو آیاتِ زیر درس میں ان الفاظ میں بیان ہوا کہ: "وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ" وہ لازماً اختلاف کرتے رہیں گے۔ اُن میں سے وہ بھی ہوں گے جو اپنے ارادہ و اختیار سے نیکی کی راہ کا انتخاب کریں گے اور اس میں اتنے آگے بڑھیں گے کہ فرشتوں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے، جو سرکشی اور تمرّد اور شیطنت کی راہ میں ایسے بگٹٹ دوڑیں گے کہ خود شیطان پناہ مانگے گا اور وہ بھی ہوں گے جو کچھ بین بین یا کبھی اُدھر کبھی اِدھر کی روش پر گامزن رہیں گے ۔ جیسے کہ فرمایا سورۂ فاطر میں "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ" یعنی "کچھ ان میں سے ظلم ڈھانے والے ہیں خود اپنے اوپر، اور کچھ ہیں میانہ رو، اور کچھ ہیں نیکیوں میں سبقت لے جانے والے اللہ کی توفیق سے!" آپ زیر درس ہیں "اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" یعنی "سوا ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہو جائے" کے الفاظ میں اشارہ ہے اسی حقیقت کی جانب کہ اس ارادہ و اختیار کے صحیح رُخ پر استعمال ہونے میں بہت بڑا دخل اللہ کی فضل و کرم اور اس کی تائید و توفیق کو حاصل ہے ۔ اس کے بعد جو الفاظ وارد ہوئے ہیں یعنی: "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" اور اسی کے لئے اُن کو پیدا کیا ہے" تو ان کا ظاہر و باہر مفہوم تو یہی ہے کہ یہ اختلافِ نیک و بد اور سعید و شقی اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق کا لازمی نتیجہ ہے ۔ لیکن "اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" کے ساتھ بالکل متصل واقع ہونے سے ان میں ایک اشارہ محسوس ہوتا ہے ۔ اس جانب بھی کہ تخلیقِ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی اصل شان جس کا ظہور مطلوب ہے شانِ رحمت ہی ہے ۔ بقول شاعر ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم ملکہ کردم خلق تا جودے کنم!

"یعنی میں نے یہ تخلیق اپنے کسی فائدے کے لئے نہیں کی ہے بلکہ اس لئے

گی ہے کہ میرے رحم و کرم اور جود و سخا کا ظہور ہو سکے! رہی سزا اور عقوبت اور عذابِ دنیوی و اخروی تو وہ تو در اصل "تعرف الاشیاء باضدادھا" کے مصداق شانِ رحیمی و غفاری ہی کے مزید واضح اور اجاگر ہونے کا ذریعہ ہیں - واللہ اعلم!! - واضح رہے کہ اس مسئلے کا ایک ربط آیات نمبر ۱۰۶ تا نمبر ۱۰۸ میں جنت اور دوزخ کی ابدیت کے ضمن میں وارد شدہ لطیف سے فرق سے بھی ہے جس پر گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے - آیت نمبر ۱۱۹ کے آخری ٹکڑے میں ارادہ و اختیار کی اس آزادی کا ایک ناگزیر نتیجہ جو نکل کر رہے گا اُس کا ذکر تہدید آمیز انداز میں کر دیا گیا کہ تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی۔ کہ میں جہنّم کو جنّوں اور انسانوں سے پُر کر کے رہوں گا - اللہ تعالیٰ کا یہ قول قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذرا سے لفظی اختلاف کے ساتھ ابلیس لعین کے اس دعوے کے جواب میں وارد ہوا ہے کہ میں نسلِ آدم کی عظیم اکثریت کو گمراہ کر کے دکھا دوں گا -

اب آیئے دوسرے سوال کی جانب کہ کسی بستی یا کسی قوم پر عذابِ استیصال یا عذابِ ہلاکت آنے کا قاعدہ کلیہ کیا ہے؟ اور وہ کونسی حد ہے جس کو پہنچ جانے کے بعد مزید مہلت نہیں ملتی اور قصہ پاک کر دیا جاتا ہے - اس کا جواب آیت نمبر ۱۱۷ میں وارد ہوا کہ: "وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ٥" یعنی "تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بڑے بڑے ظلم پر بھی کسی بستی کو تباہ کر دے جبکہ اُس کے باشندے اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہوں"۔ یہاں ظلم کی تنکیر تفخیم کے لئے ہے - انفرادی سطح پر کئے گئے بڑے سے بڑے کفر و ظلم پر بھی اللہ تعالیٰ اجتماعی ہلاکت کا حکم صادر نہیں فرماتا جبتک کہ معتد بہ لوگ اصلاح کے لئے بھی سرگرم عمل ہوں - البتہ جب یہ صورت بھی نہ رہے اور بگاڑ اتنا ہمہ گیر ہو جائے کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے آٹے میں نمک بن کر رہ جائیں تو پھر قانونِ خداوندی کے تحت عمومی ہلاکت و بربادی کا حکم صادر ہو جاتا ہے اور اس سے صرف وہی معدودے چند لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر بالفعل کاربند ہوں اور اصلاح کے لئے آخری دم تک سر توڑ کوشش کرتے رہیں کچھ اسی مضمون کو علامہ اقبال مرحوم

نے اس شعر میں ادا کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے کہ ؎

"فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے نہیں کرتی کبھی ملّت کے گناہوں کو معاف"

اب آیئے آیت ۱۱۶ کی جانب تو اس میں وضاحت فرمائی گئی ہے کہ وہ چھ اقوام معذّبہ اللہ تعالیٰ کے اسی قانونِ عذابِ عمومی کی زد میں آکر ہلاک ہوئیں۔ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ"۔ تو افسوس کہ تم سے پہلے کی ان قوموں میں نہ رہے وہ اصحابِ خیر دارباب عقل و دانش جو لوگوں کو روکتے (لوگوں کو) زمین میں فساد مچانے سے سوائے نہایت قدرِ قلیل کے جن کو ہم نے اُن میں سے بچا لیا!" "اولو بقیّہ" عربی محاورے میں کہتے ہیں ان کو جو صاحب عقل و دانش بھی ہوں اور صاحب برّ و خیر بھی۔ اور "قلیل" عربی میں a little کا مفہوم بھی دیتا ہے اور the little کا بھی اور یہاں اسی موخر الذکر مفہوم میں وارد ہوا ہے۔ مراد یہ کہ ان اقوام میں اخلاقی پستی اور تمدّنی زوال و فساد کا معاملہ اُس آخری حد تک پہنچ چکا تھا کہ اُن میں اصحاب فہم و شعور اور داعیانِ خیر و صلاح کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہو کر رہ گئی تھی۔ "نتیجۃً" وہ کیفیت پیدا ہو چکی تھی جس کا نقشہ کھینچا ہے اقبال نے اس شعر میں کہ ؎

"وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!"

نتیجۃً عذاب الٰہی کا حکم صادر ہو گیا اور پوری قوم ہلاک کر دی گئی سوائے اُن کے جو آخری دم تک اصلاح کے لئے کوشاں اور سرگرم عمل رہے تھے۔ واضح رہے کہ اسی کی ایک مثال سورۂ اعراف میں اصحاب سبت کے ضمن میں بھی آئی ہے!) قوموں کے اس عمومی فساد اور بگاڑ کے اہم عامل کی جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ اس کا اصل سبب اصحابِ دولت و ثروت اور اربابِ ناز و نعم بنتے ہیں جن کے پاس لذّت کوشیوں اور عیّاشیوں کا ساز و سامان فراوانی سے ہوتا ہے اور ان ہی میں مگن رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ اصل مجرم ہوتے ہیں جن کے اثراتِ بد پورے معاشرے پر اکاس بیل کی طرح چھا جاتے ہیں اور پوری پوری قوموں کو لے ڈوبتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے

ہمیں اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔ آمین
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(۲)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم
وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ۖ إِنَّا عَامِلُونَ ۝ وَانتَظِرُوا ۖ إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۝ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ سورۃ ھود کی آیات ۱۲۰ تا ۱۲۳ یعنی آخری چار آیات کا ترجمہ یہ ہے۔

"اور (اے نبیؐ) رسولوں کے یہ تمام اہم واقعات ہم آپ کو سنا رہے ہیں جن سے آپ کے دل کو تقویت دیں اور ان میں آگیا ہے آپ کے پاس پورا حق اور اہل ایمان کے لئے نصیحت اور یاد دہانی۔ تو کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لا رہے کہ کوشش کئے جاؤ تم اپنے ڈھب پر، ہم بھی کوشش کئے جائیں گے۔ اور تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر رہیں گے، اور آسمانوں اور زمین کا غیب تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ کل معاملہ اُسی کی جانب لوٹایا جائے گا۔ پس (اے نبی!) آپ اُسی کی پرستش کریں اور اسی پر بھروسہ رکھیں اور آپ کا رب غافل نہیں ہے اُس سے کہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو!" ترجمہ ختم ہوا — ان آیات مبارکہ پر وہ سورۃ ہود ختم ہو رہی ہے جس کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک نقل ہوا ہے کہ "شیبتنی ھودٌ واخواتھا" یعنی "مجھے سورۃ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے!" اس لئے کہ ان میں عرب اور اس کے گرد و نواح کی چھ معذب اقوام کا ذکر اس طور سے آیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب ایک بار پھر تاریخ اپنے آپ کو دوہرانے پر تلی کھڑی ہے اور سورۃ شوریٰ میں وارد شدہ الفاظ "لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا"

کے مطابق ام القریٰ یعنی مکّہ مکرّمہ اور اس کے گرد و نواح کے باشندوں کے حق میں اللہ کے عذاب استیصال کا حکم صادر ہوا ہی چاہتا ہے۔

خاتمۂ کلام کی ان آیاتِ مبارکہ میں: اوّلاً رسولوں کے حالات و واقعات سنانے کی اصل غرض و غایت بیان کی گئی: "کُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ" "تَلَا یَتْلُوْا" کی طرح "قَصَّ یَقُصُّ" کے لفظی معنی بھی پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں، پڑھنے اور بیان کرنے دونوں میں انسان کسی عبارت یا حالاتِ واقعہ کی گویا پوری طرح پیروی کرتا ہے اسی لئے یہ الفاظ پڑھنے اور بیان کرنے کے معنی میں مستعمل ہیں۔ "انباء" جمع ہے "نَبَأٌ" کی جس کے معنی میں اہم خبر۔ یا بڑا واقعہ۔ انبیاء کے احوال و وقائع کے ضمن میں عام طور پر لفظ قصص استعمال ہوتا ہے۔ جیسے قصص الانبیاء۔ یا قصصُ النبیّین جبکہ رسولوں کے حالات و واقعات کے لئے یہاں لفظ "انباء" آیا ہے۔ اور یہ بہت معنی خیز ہے۔ اس لئے کہ نبیوں کو ردّ کرنے کی صورت میں قومیں ہلاک نہیں کی گئیں۔ جبکہ رسولوں کے باب میں سنّتُ اللہ یہی ہے کہ اگر قوم اُن کی دعوت سے انکار و اعراض پر اڑ جائے تو وہ لازماً ہلاک کر دی جاتی ہے۔ اور کسی قوم کا نیست و نابود ہو کر رہ جانا یقیناً ایک بڑی خبر اور اہم واقعہ ہے۔ تو فرمایا کہ: "ان تمام رسولوں کے اہم اور عظیم واقعات ہم آپ کو اس لئے سنا رہے ہیں کہ آپ کے دل کو تقویت حاصل ہو۔ آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھے۔ اس لئے کہ ان سب کا حاصل اور لبِّ لباب یہی ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں آخری فتح رسولوں اور ان کے ساتھیوں ہی کو حاصل ہوتی ہے اور منکرین و مخالفین بالآخر ہلاک اور نیست و نابود ہو کر رہتے ہیں جیسے کہ ارشاد ہوا سورۂ بنی اسرائیل میں "وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" — "کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل ڈھ گیا اور باطل تو ہے ہی (بالآخر) ڈھ جانے والی چیز!" یا جیسے فرمایا سورہ صٰفّٰت میں:۔ "وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝" یعنی "ہمارے ان بندوں کے حق میں جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا ہمارا یہ فیصلہ پہلے ہی ثبت ہو چکا ہے کہ اُن کی مدد لازماً کی جائے گی اور بالآخر

ہمارا لشکر ہی غالب آکر رہے گا!" اب ظاہر ہے کہ اس یقین دہانی سے بڑھ کر رسول اور اس کے ساتھیوں کے دلوں کو ثبات عطا کرنے والی بات اور کونسی ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی بھی اللہ کی نصرت و تائید اور اُس کی جانب سے تثبیت قلبی کا محتاج ہوتا ہے۔ آگے فرمایا:۔ وَجَاءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ یعنی "ان (انبیاءُ الرسُول) میں آپ کے پاس کامل حق بھی آگیا ہے۔ اور اہل ایمان کے لئے بڑی نصیحت و موعظت بھی اور مؤثر یاد دہانی بھی۔" "الحق" کو معرفہ لاکر گویا واضح کر دیا کہ یہ سب سرتا سر حق ہے، یعنی ماضی کے اعتبار سے واقعی اور حقیقی بھی ہے اور مستقبل کے اعتبار سے قطعی اور حتمی اور لامحالہ شدنی بھی!۔ "موعظہ" کی تنکیر تفخیم پر دلالت کر رہی ہے یعنی وہ نصیحت جو بہت عظیم اور وقیع ہے اور وہ یاد دہانی جو نہایت اثر انگیز و دلپذیر ہے۔ فَلِلّٰهِ الحمد والمنّة!!

آیات ۱۲۱ و ۱۲۲ میں کافروں اور منکروں اور مخالفوں اور معاندوں کو چیلنج کیا جا رہا ہے کہ تم بھی اپنی سی کر دیکھو ہم بھی اپنی سی محنت کئے جائیں گے، پھر تم بھی حکم خداوندی کا انتظار کرو۔ ہم بھی اس کے منتظر ہیں: "وَقُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عٰمِلُونَ ۝ وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ۝"۔ 'عمل' اور 'فعل' میں یہ فرق ہے کہ فعل کسی بھی کام کو کہہ دیا جائے گا خواہ بلا ارادہ ہو خواہ بلا ارادہ۔ اور خواہ مشقت طلب ہو یا آسان جبکہ "عمل" وہ کوشش ہے جو بالارادہ کی جائے اور اس کے نتیجے میں محنت و مشقت لاحق ہو۔ اس طرح گویا اس میں اسی اعتماد کی بنا پر جو پہلی آیت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ بالآخر فتح اہل ایمان ہی کی ہوگی کفار و مشرکین کو کھلا چیلنج دیا جا رہا ہے کہ تم سے جو بن آئے کر گذرو۔ اور پورا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر حق کا راستہ روکنے کی کوشش کر دیکھو مبادا تمہارے دلوں میں کوئی حسرت رہ جائے۔ یہ بالکل وہی انداز ہے جو سورۂ ہود سے ماقبل کی سورت یعنی سورۂ یونس میں منقول حضرت نوحؑ کے قول میں وارد ہوا ہے کہ:۔ يٰقَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى

اللّٰہِ تَوَکَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ وَشُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ○ یعنی: "اے میری قوم کے لوگو! اگر تم پر میرا قیام اور اللہ کی آیات کے ذریعے تذکیر و نصیحت کا کام بہت شاق گذر رہا ہے تو میں نے تو اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے۔ اب تم مجھے مزید کوئی مہلت عطا کئے بغیر اپنا معاملہ اور اپنے مزعومہ شرکاء کی قوت سب جمع کر کے میرا جو فیصلہ چکا سکتے ہو چکا دو اور اس میں ہرگز کسی ہچکچاہٹ سے کام نہ لو!" — رسولوں کی جانب سے یہ انداز تخاطب ظاہر ہے کہ آغازِ دعوت میں نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ قوم پر اتمام حجت ہو چکا ہوتا ہے اور اب اعلانِ برأت کا وقت ہوتا ہے ان آیاتِ مبارکہ میں "اِنَّا عٰمِلُوۡنَ" اور "اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ" میں جمع متکلم کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جبکہ آغاز میں فعل امر واحد کے صیغے سے آیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھ اہل ایمان درحقیقت ایک ہی حقیقت واحدہ ہوتے ہیں جیسے کہ فرمایا سورۂ فتح کے آخر میں "مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ" فصلی اللہ علیہ وسلم۔ ورضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

آخری آیت جامع ترین خاتمہ کلام ہے:۔ وَ لِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" یعنی "اللہ ہی کا ہے غیب آسمانوں اور زمین کا" لِلّٰہ میں لام، لام تملیک ہے۔ یعنی اللہ ہی کی ملکیت ہے اور اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے کُل کا کُل غیب خواہ آسمانوں کا ہو خواہ زمین کا۔ اس میں علم اور قدرت دونوں کی جانب اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ پردۂ غیب سے جو کچھ ظہور میں آنے والا ہے اس کا حتمی اور قطعی علم بھی صرف اللہ ہی کے پاس ہے اور اس کا کل کُل اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ "وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ" "اور کُل کا کُل معاملہ (آخری فیصلہ کے لئے) لازماً اسی کی جانب لوٹایا جائے گا"۔ یعنی ہر معاملہ ظہور میں آنے سے قبل علم خداوندی میں ہے،

اُس کا ظہور میں آیا بھی کُلیتہً اُسی کے اِذن و مشیّت سے ہے اور پھر وہ اُسی کی جانب لوٹا بھی دیا جائے گا۔ ان حقائق کے منکشف ہو جانے کا تقاضا وہ ہے جو بعد میں بیان ہوا یعنی :۔ "فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ" یعنی : "پس اسی کی بندگی اور پرستش کرو۔ اور اسی پر توکّل و اعتماد رکھو۔ واضح رہے کہ یہ انسانی زندگی کے عملی اعتبار سے دو رُخ ہیں — یعنی ایک جانب اُس کے اعضاء و جوارح سے جو افعال و اعمال اور حرکات و سکنات صادر ہوں وہ سب کی سب اللہ کی اطاعت و بندگی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اور اسی کی محبّت کی خوشبو میں رچی بسی ہوئی ہوں۔ اور دوسری جانب ان کے نتیجہ خیز یا بار آور ہونے کے ضمن میں توکّل و اعتماد — یا بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہو۔ نہ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں پر، نہ اپنی پیش بینوں اور دور اندیشیوں پر، نہ اپنی ذہانت و فطانت پر اور نہ اپنی کوشش و محنت پر۔ آخر میں فرمایا :۔ "وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ" "اور تیرا ربّ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم سب کر رہے ہو" — یہاں پھر وہی انداز ہے کہ "ربّک" ضمیر واحد ہے — اور "تعلمون" میں ضمیر فاعلی جمع کی ہے۔ گویا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم ایک وحدتِ مطلقہ ہیں۔ بقول شاعر "من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جان شدی، تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!" — یہی وجہ ہے کہ جب حکم ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدّیق نے آنحضورؐ کی خدمت میں ایک ناقہ پیش کی اور حضورؐ نے فرمایا کہ میں اس کی قیمت ادا کروں گا تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور انہوں نے عرض کیا! "یا رسُولَ اللہ! یہ جان اور مال کیا کسی اور کیلئے ہیں؟" فصلی اللہ علیہ وسلم، ورضی اللہ تعالےٰ عنہ وارضاہُ —

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ

جنوبی ہند میں پندرہ دِن

(پانچویں قسط)

از قلم ، قاضی عبدالقادر

اشکبار آنکھوں سے مدراس ایرپورٹ پر احباب کو رخصت کیا - ایر انڈیا کا بوئنگ ۷۳۷ ، سات بج کر دس منٹ پر روانہ ہوا اور اُس نے آٹھ بج کر پچاس منٹ پر یعنی ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں بمبئی پہنچا دیا - بمبئی سے مدراس آتے وقت چونکہ رات کا وقت تھا اس وجہ سے راستہ کے مناظر نہ دیکھ سکے - اب دن کے وقت سفر کی وجہ سے ہم راستہ کے دلفریب مناظر سے خوب لطف اندوز ہوئے - خاص کر بمبئی شہر کے اوپر سے جب طیارہ گذرا تو شہر اور سمندر کے منظر نے ایک نیا لطف دیا - ایر انڈیا کی اس فلائٹ کے کیپٹن ایک مسلمان یعنی مصطفیٰ صاحب تھے - مدراس سے بمبئی کا سفر پلک جھپکتے جیسے گذر گیا - راستہ بھر مدراس کے احباب کا خلوص اور اُن کی محبت یاد آتی رہی — ناشتہ کیلئے پوچھا گیا VEGETARIAN یا NON-VEGETARIAN ؟ ڈاکٹر صاحب نے VEGETARIAN کا آرڈر دیا - میں نے بھی اسی پر عمل کیا - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ جب بھی بیرونِ ملک سفر کرتے ہیں تو VEGETA-RIAN - کھانا ہی استعمال کرتے ہیں - احتیاط کا تقاضا یہی ہے اس لئے کہ گوشت کا پتہ نہیں کیسا ہو — !

جہاز نے ہمیں بمبئی کے DOMESTIC AIRPORT یعنی سانتا کروز پر اُتارا - الحمدللہ کہ مدراس جاتے وقت جیسا معاملہ پیش نہیں آیا - عبدالصمد صاحب نے مدراس سے فون کر کے بمبئی میں قیام وغیرہ کے ہمارے تمام

انتظامات کر دیتے تھے۔ پاپولر سولا ہیٹ ورکس کے حاجی اے۔ رحیم صاحب کا ڈرائیور محمد سلطان گاڑی لے کر ایر پورٹ پر موجود تھا۔ اُسے ہمیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اس لئے کہ مدراس جاتے ہوئے، بمبئی میں وہ ہمیں دیکھ چکا تھا۔ حالانکہ اُس وقت ہم بڑی "کسمپرسی" کی سی حالت میں تھے۔ بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ "شرنارتھی" تھے مگر ٹھیرئیے "شرنارتھی" نہیں کہ اس میں "شر" شامل ہے۔

خیر تو خیر ہے ہی شر کا معاملہ بھی عجیب ہے
یہ "لبشر" جو شے ہے اس میں بھی "شر" ہے

(۲/۳) دو بٹا تین - بلکہ اور آگے بڑھئے یہ جو ہم لوگوں کو بڑے اخلاص سے "شریف" کہتے ہیں تو ان شریف لوگوں میں بھی ہے "شر" ایک بٹا دو (۱/۲) ———— اور شرافت کی تو حد ہی ہو گئی۔ شرافت تو دو الفاظ سے مِل کر بنا ہے یعنی "شر" اور "آفت" ———— اب کہنے کو تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ اجی۔ شرافت تو آپ کے چہرے سے ٹپک رہی ہے اور آپ ہیں کہ پھولے نہیں سماتے کیوں! کیا غلط کہہ رہا ہوں میں ؟ ــــ حالانکہ حضور والا۔ جو چیز چہرے سے ٹپک رہی ہے وہ ہے شر جمع آفت (شر + آفت) آیا خیال شریف میں ؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

بمبئی ایر پورٹ پر ٹریفک کا بڑا نظم وضبط دیکھا۔ یہ نظم وضبط یوں تو پورے شہر میں ہے۔ ہمارے کراچی اور لاہور کی طرح نہیں کہ ایر پورٹ پر ٹیکسی والے لوٹتے ہی نہیں مسافر کی کھال اُدھیڑ لیتے ہیں۔ ایر پورٹ کے گیٹ سے باہر نکلے نہیں کہ ٹیکسی والوں نے "اُچکنا" شروع کر دیا۔ کہ اچھا خاصا دِل گردہ والا آدمی بھی گھبرا جائے ــــ یہاں پر ٹیکسیاں ایک قطار میں ہوتی ہیں۔ ایک ایک کر کے آتی ہیں۔ اور میٹر کے مطابق مسافر کو لے کر منزلِ مقصود پر روانہ ہو جاتی ہیں۔

محمد سلطان ڈرائیور سے ہم نے کہا کہ پی۔ آئی۔ اے کے دفتر ہوتے ہوئے چلنا۔ تاکہ ہم کراچی کے لئے اپنی سیٹ مزید کنفرم کرا سکیں۔ اُسے راستہ میں تاکید بھی کی لیکن وہ بھلا آدمی سیدھا ہمیں ہماری قیام گاہ لے گیا۔

مدراس میں ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ بمبئی میں ہمارا قیام ٹامل ناڈو بیت الحجاج میں رہے گا۔ اس کا نام پہلے مدراس بیت الحجاج تھا۔ یہ چار منزلہ عمارت مسلمانوں کے مشہور محلہ بھنڈی بازار کی مسجد اسٹریٹ میں واقع ہے۔ صوبہ ٹامل ناڈ کے حجاج کرام کے قیام کے لئے اسے تعمیر کیا گیا ہے لیکن حج کے مہینوں کے علاوہ اسے ٹامل ناڈ سے آنے والے مسلمان استعمال کرتے ہیں جس کا اُن سے کرایہ وصول کیا جاتا ہے جو ظاہر ہے ہوٹلوں کے گراں کرایوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ یہاں پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اِس لئے جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ ہمارے لئے دو بیڈ کے ایک کمرہ کی بکنگ مدراس ہی سے کرا دی گئی تھی۔ بیت الحجاج کا انتظام ایک کمیٹی چلاتی ہے۔ جس کے صدر آج کل پاپولر سولاہیٹ فیکٹری کے حاجی رحیم صاحب ہیں۔

بیت الحجاج کے مینجر شوکت صاحب نفیس آدمی ہیں بہت ملنسار ہیں۔ ہمارا انہوں نے پُر تپاک خیر مقدم کیا چوتھی منزل پر کمرہ ۴۰۲ کی صفائی کرائی۔ کھڑکیوں کے پردے وغیرہ تک تبدیل کرائے اور یوں ہم نے یہاں پر بمبئی کے اپنے چار روزہ قیام کا آغاز کیا۔

معلوم ہوا تھا کہ حاجی اے۔ رحیم صاحب ملاقات کے لئے آنے والے ہیں۔ شام تک ہم اُن کا انتظار کرتے رہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں پاسپورٹ کا اندراج کرانے کے لئے اُن کا ڈرائیور ہمیں لے جاتا۔ بمبئی کی زندگی بہت ہی مصروف زندگی ہے۔ شاید مصروفیت کی بنا پر شام تک وہ نہیں آسکے انتظار کی وجہ سے ہم بھی پروگرام بنا کر کہیں نہ جا سکے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر کمرہ ہی میں آرام کرتے رہے۔ چلئے اس بہانے ڈاکٹر صاحب کو اور مجھے کچھ آرام ہی مل گیا۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ـــــ اور ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر ایک چیز میں ہمیں خیر نظر آئے لیکن اُس کے پیچھے شر چھپا ہو اور یہ بھی کہ بظاہر ایک چیز میں شر نظر آرہا ہو لیکن اُس کے پیچھے خیر چلا آرہا ہو۔ قرآن حکیم نے اسی عظیم حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

ڈاکٹر صاحب تو حاجی صاحب کے انتظار کی وجہ سے کمرہ ہی میں رہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا سیلانی طبیعت جو ٹھہری، عصر کی نماز کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ نواب مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر سب سے پہلے تو میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوں۔ بمبئی کے کون سے علاقہ میں ہوں۔ بھنڈی بازار کا نام معلوم تھا۔ ایک دوکاندار سے پوچھا کہ بھائی بھنڈی بازار کدھر ہے۔ کہنے لگا کہ یہی تو ہے جہاں تم کھڑے ہو۔ معلوم ہوا کہ یہیں سے بھنڈی بازار شروع ہوتا ہے۔ دوکانوں کے سائن بورڈوں پر یہ پہلے پڑھ ہی لیا تھا کہ جس سڑک پہ میں کھڑا ہوں۔ یہ ابراہیم رحمت اللہ روڈ / انگریزی میں (IBRAHIM RAHIMTOOLAH ROAD) ہے۔ پتہ کیا۔ محمد علی روڈ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ دوکاندار نے بتایا کہ وہ سامنے محمد علی روڈ ہے۔ جہاں تم کھڑے ہو یہاں پر محمد علی روڈ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ سے آکر مل جاتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ شمس پیرزادہ صاحب کا دفتر محمد علی روڈ پر ہے۔ مدراس جاتے ہوئے محمد علی روڈ کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اس لئے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ شمس پیرزادہ صاحب کے دفتر چلا جائے۔ جس بلڈنگ میں وہ دفتر تھا اُسے میں پہلے دیکھ چکا تھا اس لئے اندازہ تھا۔

شمس پیرزادہ صاحب جماعت اسلامی کے رکن ہوتے تھے۔ بلکہ بہت عرصہ تک بمبئی کی جماعت کے امیر رہے۔ مسز اندرا گاندھی جنتا پارٹی کی حکومت سے قبل جب برسر اقتدار تھیں اور ملک میں ایمرجنسی نافذ کی تھی تو جماعت اسلامی کے لیڈروں اور نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ شمس پیرزادہ صاحب کو بھی اس دَور میں جیل کی سلاخوں کو چُومنے کی سعادت نصیب ہوئی ؎

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد جب اُن کی رہائی ہوئی تو اس کے کچھ عرصہ کے بعد طریق کار کے اختلاف کے باعث جماعت اسلامی سے مستعفی ہو گئے۔ پیرزادہ صاحب کا اختلاف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اختلاف کے بالکل اُلٹ تھا — یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے جماعت اسلامی پاکستان سے استعفیٰ کی وجہ یہ تھی کہ

جماعت کو بنیادی کام مضبوط ہوجانے کے بعد ہی عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ جب کہ پیرزادہ صاحب کا اختلاف یہ تھا کہ جماعت اسلامی ہند ملک کی سیاست میں اپنا بھرپور کردار کیوں نہیں ادا کر رہی۔ اُسے جماعت کی حیثیت سے باقاعدہ الیکشن میں حصہ لینا چاہیئے ــــ اس سلسلہ میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اب سے کوئی سات آٹھ سال قبل (صحیح سنہ تو یاد نہیں) حج کے موقعہ پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ملاقات شمس پیرزادہ صاحب سے حرم شریف میں ہوئی۔ کافی دیر گفتگو رہی۔ قریب ہی ایک عمارت میں قیام تھا۔ اُس کی چھت پر دونوں حضرات کی تحریکی مسائل پر رات کو بہت دیر تک گفتگو رہی۔ دونوں اپنے اپنے موقف پر دلائل دے رہے تھے اور جمے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان کا وقت قریب آ پہنچا۔ تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی کہ چلئے پچاس فی صد تو ہم میں اتفاق ہے کہ جماعت اسلامی اپنے گذشتہ موقف سے ہٹ چکی ہے۔ اب اپنی باقی پچاس فی صد اختلاف کی بات تو اللہ تعالےٰ نے پھر کبھی موقعہ دیا تو گفتگو کریں گے۔

مدراس سے ہم نے شمس پیرزادہ صاحب کو فون کر دیا تھا کہ ہم فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ بمبئی پہنچ کر بھی فون پر بات ہوگئی تھی۔ اور طے ہوا تھا کہ ہماری قیام گاہ کے قریب کی نواب مسجد میں وہ عصر کی نماز ادا کریں گے اور ہم بھی وہیں پڑھیں گے۔ لیکن مسجد میں نمازی اس قدر تھے کہ ملاقات نہ ہوسکی۔ شمس پیرزادہ صاحب کے نام سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ بھاری بھرکم جسم کے ہوں گے۔ لانبی داڑھی ہوگی یعنی کچھ کچھ مولانا سیّد شاہ صبغۃ اللہ بختیاری صاحب جیسے۔ لیکن وہ تو نحیف جسم کے چھوٹی داڑھی والے بہت ہی نستعلیق قسم کے آدمی نکلے۔ وہ دروازہ پر ہمارا انتظار کرتے رہے اور میں اُن کا۔ آخر کو ڈاکٹر صاحب تو حاجی رحیم صاحب کا انتظار کرتے قیام گاہ چلے گئے اور میں ڈاکٹر صاحب کے بتائے بغیر ڈھونڈتے ڈھانڈتے شمس پیرزادہ صاحب کے دفتر جا پہنچا۔ ان کا دفتر بمبئی کی مشہور سڑک محمد علی روڈ کی کئی منزلہ بڑی عمارت کی پہلی منزل پر دو کمروں میں واقع ہے۔ دوکانوں، مکانوں اور دفتروں کی یہاں پر کراچی سے بھی زیادہ پگڑیاں ہیں۔ کرایہ تو کم ہوتا ہے مگر پگڑی بہت زیادہ۔ چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر

مشتمل اس دفتر کو شمس پیرزادہ صاحب کے ادارہ نے کئی لاکھ روپے پگڑی دیکر حاصل کیا تھا۔ ان کے ادارہ کا نام "ادارۃ دعوۃ القرآن" ہے جس نے اب تک متعدد کتب شائع کی ہیں۔ ان میں شمس پیرزادہ صاحب کی مرتبہ تفسیر دعوۃ القرآن بھی ہے۔ اب تک اُردو، گجراتی اور مرہٹی میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" کا ترجمہ و تلخیص شمس پیرزادہ صاحب نے کیا ہے۔ یہ کتاب بھی اِسی ادارہ نے شائع کی ہے۔

نمازِ عصر کے بعد میں جب اُن کے دفتر میں داخل ہوا تو شمس پیرزادہ صاحب مجھے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سمجھے کیونکہ زندگی میں اُن کی ڈاکٹر صاحب سے ایک ہی بار ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی اب سے سات آٹھ سال قبل۔ مجھے دیکھ کر انہیں تعجب بھی ہوا کہ سات آٹھ سال میں ڈاکٹر صاحب میں خاصا تغیّر واقع ہو گیا ہے میری سماعت کچھ کمزور ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں یہ نہ سُن سکوں کہ "آیئے" ڈاکٹر صاحب تشریف لایئے۔" اور اتنا کہہ کر وہ معانقے کر چکے تو میں نے عرض کیا کہ میں ڈاکٹر صاحب نہیں، میں تو اُن کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور میرا نام عبدالقادر ہے ـــ جب جاکر اُن کی غلط فہمی دُور ہوئی۔ خاصی دیر اُن کے پاس بیٹھا اُن کی شیریں گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا ـــ طے پایا کہ نمازِ مغرب کے بعد شمس پیرزادہ صاحب ہماری قیام گاہ پر تشریف لائیں گے۔ پیرزادہ صاحب نے مجھے اپنے ادارہ کی شائع کردہ کتاب "فقہ الزکوٰۃ" عنایت فرمائی۔ واپس آکر میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ میں شمس پیرزادہ صاحب سے مِل بھی آیا ہوں اور اب وہ نمازِ مغرب کے بعد تشریف لا رہے ہیں ـــ ڈاکٹر صاحب میرے "سیلانی پن" کے قائل کچھ تو پہلے سے تھے۔ اب اور ہو گئے!

مغرب کے بعد شمس پیرزادہ صاحب تشریف لے آئے ڈاکٹر صاحب سے مِل کر بہت خوش ہوئے۔ عشاء تک بہت سے مسائل پر اُن سے گفتگو ہوتی رہی۔ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھ کر ہم اپنی قیام گاہ واپس آتے۔ کھانا کھایا اور پھر سو گئے۔ کھانے کا آج تو ہم نے انتظام یہ کیا تھا کہ قریب کے ہوٹل کے لڑکے سے کھانا منگا لیا تھا۔ وہی چائے بھی لا دیتا تھا۔ بیت الحجاج میں کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہاں پر مقیم حضرات تو کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھا لیتے تھے۔ یا قریب

کے ہوٹل کا لڑکا چکر لگاتا رہتا تھا اُس سے منگا لیا جاتا تھا — کھانا واجبی سا تھا جس کو کھا کر خدا کا شکر ادا کیا — یوں بھی یوں تو میں ڈاکٹر صاحب بھی کھانے میں کسی چیز کے عادی نہیں ہیں جو مل جائے سو کھا لیتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ آیا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں (میزبان حضرات سُن لیں!) کہ ڈاکٹر صاحب کو سبزیوں میں بھنڈی (بھنڈی کی مناسبت سے بھنڈی بازار بھی پسند ہے) اور مٹھائیوں میں امرتی پسندیدہ ہے ۔ امرتی کا ذکر آیا ہے تو شاید آپ نے سنا ہو کہ لندن میں کسی مٹھائی فروش کی دوکان پر گرم گرم امرتیاں رکھی تھیں ۔ ایک میم صاحب کھڑی ان امرتیوں کو بار بار اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں ۔ اُن کے یہ سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ اس پیچیدہ ٹیوب میں شیرہ بھرا کدھر سے گیا ہے! کیونکہ انہیں کہیں جوڑ نظر نہیں آتا تھا ۔ میزبان صاحب یہ بھی نوٹ فرمالیں کہ ڈاکٹر صاحب کو لہسن کی چٹنی بہت مرغوب ہے ۔ اگر موصوف کو صرف سادہ روٹی اور لہسن کی چٹنی دیدی جائے تو نہایت شوق سے پیٹ بھر کر کھانا کھالیں گے — سردیوں میں خصوصًا فجر سے قبل ایک کپ چائے پیتے ہیں ۔ اس کے کئی فائدے ہیں ۔ اجابت ہوجاتی ہے ۔ حلق صاف ہو جاتا ہے اور نماز اچھی طرح پڑھا دی جاتی ہے ۔ سردیوں میں سردی کا اثر کم ہوجاتا ہے ۔ یوں گرمیوں میں بھی فجر سے قبل چائے پی لیا کرتے ہیں ۔ چائے زیادہ گرم اور پانی زیادہ ٹھنڈا پینا پسند فرماتے ہیں ۔ نہانے سے قبل ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اور بعد گرم چائے نوش فرماتے ہیں ۔ نہانے کے لئے خصوصًا سردیوں میں پانی گرم کراتے ہیں لیکن وضو ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے کرتے ہیں چاہے کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو ۔ نہاتے ناشتہ کرنے کے بعد ہیں ۔ انہیں دقت ہوتی ہے اگر لیٹرین اور باتھ رُوم علیحدہ علیحدہ ہوں — صبح ہی صبح اخبار کا شدّت سے انتظار کرتے ہیں لیکن بہت جلد ہی مطالعہ کر لیتے ہیں ۔ دوپہر کو قیولہ ضرور کرتے ہیں ورنہ طبیعت مضمحل سی رہتی ہے — یہ ہیں چند معمولات ڈاکٹر صاحب کے جو میں نے آپ کو بتا دیئے ہیں — آپ میزبان کبھی رہے ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں یہ نسخہ آپ کے کام آئے گا — مجھے البتہ ڈر ڈاکٹر صاحب سے ہے کہ وہ یہ نہ کہیں کہ یہ سب کچھ کیوں لکھ ڈالا؟

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

لیکن مجھے اُمید ہے کہ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ عادت کے بموجب ڈاکٹر صاحب میرا یہ رپورتاژ نہیں پڑھیں گے اس لئے میں ہر طرح محفوظ (SAFE) ہوں!۔

۸۱، ۱، ۲۱ بدھ فجر کی نماز قریب کی نواب مسجد میں پڑھی - بہت بڑی مسجد ہے - امام صاحب شافعی ہیں - یہاں پر مسجدیں بہت ہیں، قریب قریب ہیں اور کشادہ ہیں - نواب مسجد کے قریب ہی منارہ مسجد اور حمیدیہ مسجد بھی ہیں -

بمبئی کراچی سے بہت مشابہ ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ کراچی بمبئی سے بہت مشابہ ہے - ہم جس علاقہ میں تھے یہ مسلمانوں کی گنجان آبادی والا علاقہ ہے - معلوم ہی نہیں ہوتا تھا - کہ ہم ہندوستان میں ہیں - کراچی کی طرح یہاں بھی فٹ پاتھ ٹوٹی سڑکیں، کوڑا کرکٹ سے بھرپور گلیاں، ملباری کے گندے ہوٹل، فٹ پاتھوں پر سوئے ہوئے لوگ، دیواروں کے نیچے بیٹھے بھکاری یا پھر قسمت کا حال بتانے والے "پروفیسر" جن کو شاید اپنی قسمت کا حال معلوم نہ ہو سے

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

غرض کہ جو کچھ کراچی میں ہے وہی بمبئی میں ہے - بمبئی میں اونچی اونچی عمارتیں (SKY SCRAPPERS) بہت بن گئی ہیں - کراچی میں بھی بن رہی ہیں لیکن بمبئی کے مقابلہ کی نہیں —— کراچی کیا ہے یوں سمجھئے چھوٹا سا بمبئی ہے دونوں (METROPOLITAN CITIES) ہیں - ہر جگہ کے لوگ آپ کو یہاں مل جائیں گے -

مسجد کے سامنے ہی گلی میں ملباری کا چھوٹا سا ہوٹل ہے صبح ہی صبح یہاں پر چائے اور میٹھے توس ملتے ہیں - اسی طرح کے اور بھی یہاں بہت سے ہوٹل ہیں - لیکن اکثر جگہ صبح ہی صبح کا ناشتہ یہی ہوتا ہے - مزدور لوگ صبح کو یہ سستا اور ہلکا پھلکا سا ناشتہ کر کے اپنے اپنے کاموں کو چلے جاتے ہیں - ہم جب تک بمبئی میں رہے فجر کی نماز کے فوراً بعد یہ چھوٹا ناشتہ (MINI BREAKFAST) ضرور کرتے تھے —— فجر سے قبل ڈاکٹر صاحب کو جو کام چائے دیتی تھی اُس کا ایک حصّہ

اس ناشتہ سے پورا ہو جاتا تھا - قیام گاہ پر آرام کرنے کے بعد اصل ناشتہ یا بڑا ناشتہ بعد میں کیا جاتا تھا -

ملباری کے ہوٹل میں چھوٹا ناشتہ کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ دیواروں پر اردو میں بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے - پوسٹر لگنا روزمرہ کا معمول تھے - آج کا پوسٹر شری بھوگناجی کی بمبئی میں پبلک میٹنگ سے متعلق تھا جسے مسلمانوں کی کسی تنظیم نے شائع کیا تھا - جہازی سائز کے دو طرح کے پوسٹر تھے - ایک پر تو بھوگناجی کی بڑی تصویر تھی اور نیچے نام اور جلسہ کا مقام اور وقت تحریر تھا اور دوسرے کا عنوان تھا "مسلمانوں کا نجات دہندہ" اور پھر بھوگناجی کی خوبیاں گنا گنا کر فرزندانِ توحید کو جوق در جوق جلسہ میں شرکت فرما کر ثواب دارین حاصل کرنے کی اپیل کی گئی تھی - شری بھوگناجی جو ہندو ہیں - مرکزی کابینہ میں وزیر بھی رہ چکے ہیں - مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے اُن میں مقبول ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں - کہتے ہیں کہ کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے مسلمانوں کو کچھ فائدے بھی پہنچائے یا کم از کم اُن کے ساتھ تعصب نہیں برتا متعصب اور کٹر ہندو انہیں طنزاً مسلمانوں کا قائد اعظم کہتے ہیں — بہر حال آج اُن کے جلسے کے پوسٹر لگے ہوئے تھے جلسہ کا اہتمام مسلمانوں کی تنظیم کی طرف سے تھا اور انہیں "مسلمانوں کا نجات دہندہ" بتایا جا رہا تھا — — کیا زمانہ آگیا کہ مسلمانوں کی طرف سے ایک کافر کو مسلمانوں کا نجات دہندہ قرار دیا جا رہا ہے - کیا اُمتِ مسلمہ اب اتنی بنجر ہو چکی ہے کہ اُس میں کسی "نجات دہندہ" کے پیدا ہونے کی اُمید نہیں رہی - فاعتبروا یا اولی الابصار — ! ع

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

بعض حضرات فیشن کے طور پر یا انگریزوں سے مرعوبیت کی بنا پر اپنا اچھا بھلا نام انگریزی میں اس طرح بگاڑ کر لکھتے ہیں کہ اصل نام کا پتہ ہی نہ چلے - ایسا ہی ایک اتفاق ہمیں بمبئی میں ہوا - ڈاکٹر صاحب انگریزی اخبار دیکھ رہے تھے - ایک تصویر شائع ہوئی تھی اور نیچے (CAPTION) تھا کہ وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مسٹر انتولے (MR ANTOLAY) عید میلاد النبیؐ کے جلوس

کو (LEAD) کر رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب کو تعجب ہوا کہ ایک ہندو اور میلاد النبیؐ کے جلوس کی قیادت کرے - یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ! بعد میں ایک صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وزیر اعلیٰ صاحب خیر سے مسلمان ہیں - جن کا اصل نام عنایت علی ہے جسے وہ انگریزی میں انتولے لکھتے ہیں - اسی طرح تحریک پاکستان کے ایک ممتاز رہنما حبیب ابراہیم رحمت اللہ صاحب اپنے نام کے آخری لفظ کو انگریزی میں رحیم تولہ (RAHIM TOOLA) لکھتے ہیں - میرے دوران ملازمت میں ایک جنرل مینجر ہوتے تھے جناب آر - اے - صدیقی صاحب - انتقال ہو گیا - اللہ تعالےٰ اُن کی مغفرت فرمائے - آمین - وہ صدیقی کو انگریزی میں SADIQUE لکھتے تھے اب اس کو لوگ صادق پڑھیں گے صدیقی تو نہیں " جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے "۔

ابراہیم رحمت اللہ روڈ اور مولانا محمد علی روڈ کی تھوڑی دیر میں نے ڈاکٹر صاحب کو سیر کرائی - قیام گاہ پر واپس آکر کچھ دیر آرام کیا - ہوٹل کا لڑکا آگیا - اُسے ناشتہ کا آرڈر دیا ناشتہ میں روٹی اور قیمہ تھا - قیمہ بھی بُھنا ہوا اور بمبئی والا ـــــ تھا تو واجبی سا مگر اس وقت مزہ ہی تو آگیا ـــــ کہئے یہ آپ کے منھ میں پا ـــــ خیر چھوڑیئے آپ بزرگ ہیں کہیں گستاخی نہ ہو جائے ڈر لگتا ہے ـــــ قیمہ اور روٹی کھائی اور چائے پی وہ بھی ڈبل والی ـــــ اس لئے کہ سنگل چائے تو بقول کسے " دانتوں میں پلک کے رہ جاتی ہے " ـــــ ہمارے ایک دوست ہیں جو خیر سے اپنی وضعداری میں بے مثال ہیں - چائے پینے کے بعد بھی اپنے دانتوں میں خلال فرمایا کرتے ہیں کہ کہیں کسی دانت شریف میں چائے اٹکی نہ رہ گئی ہو - اللہ اکبر ـــــ یہ لوٹنے کی جائے ہے !!

حاجی رحیم صاحب نہ کل آئے تھے نہ آج صبح - بیت الحجاج کے مینجر شوکت صاحب سے جا کر معلوم کیا - کہنے لگے کہ آج کسی وقت آئیں گے ضرور - ہم نے اُن کے گھر فون کیا - فرمانے لگے کہ وہ خود تو شام کو آئیں گے البتہ اپنی گاڑی ابھی بھیج دیں گے تاکہ سی - آئی - ڈی - آفس اور ایر لائن وغیرہ کے کام نپٹائے جا سکیں - اس

لئے کہ ہم تو شہر سے واقف نہ تھے - اُن کا ڈرائیور ہمیں ساتھ لے جاتا -

حاجی رحیم صاحب کی گاڑی کے بارے میں دراصل ہمیں مدراس میں عبدالصمد صاحب نے بتایا تھا کہ آنے جانے کے سلسلہ میں ہم جب چاہیں اُن کی گاڑی منگا سکتے ہیں - جب حاجی صاحب کے "ابھی" کو بھی ایک گھنٹہ گذر گیا اور گاڑی نہ آئی تو شوکت صاحب سے کہہ کر ہم نے بیت الحجاج کے ایک لڑکے منیر کو ساتھ لے لیا تاکہ ہمیں گائیڈ کر سکے - اور ٹیکسی پکڑی -

سب سے پہلے تو ہم سی - آئی - ڈی - آفس گئے - ہماری توقع کے خلاف یہ قریب ہی تھا - کرافورڈ مارکیٹ کے برابر - پیدل کا راستہ تھا - وہاں اور بھی بہت سے پاکستانی اندراج کے لئے آئے ہوئے تھے - جو آتا تھا اُسے پرچی دیدی جاتی تھی ہر شخص اپنے نمبر پر اندر کمرہ میں چلا جاتا تھا - باہر بنچ پر سائے میں لوگ انتظار میں بیٹھے تھے - ہمارے ہاں جیسی افراتفری نہ تھی - ہمارا نمبر جب آیا تو میں اپنا اور ڈاکٹر صاحب کا پاسپورٹ اور ویزا لے کر اندر گیا - وہاں کا عملہ بہت ہی خوش خلقی اور تواضع سے پیش آیا - پہلے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن جب کام ہو جانے کے بعد ہم سے چائے پانی کا مطالبہ ہوا تو قلعی کھل گئی — معلوم ہوا کہ خوش خلقی اور تواضع کے پیچھے دراصل پیسہ بول رہا تھا - انڈیا کے بارے میں معلوم ہوا کہ رشوت اور کرپشن میں اگر ہم سے آگے نہیں تو کم بھی نہیں — یہی تو ایک سب سے بڑی انڈسٹری ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ ان دو ملکوں میں پھل پھول رہی ہے اس میں کوئی دوسرا ملک ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا — ہم سے جب چائے پانی کا مطالبہ ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ کام تو ہم نہیں کر سکتے تھے - میں نے معذرت کر لی - اُس نے ایسی آنکھوں سے ہمیں دیکھا جیسے کچا ہی تو نگل جائے گا — اس لئے کہ پاکستانیوں میں سے اس طرح معذرت کرنے والا شاید ہی اُسے کوئی ملا ہو ورنہ ہر شخص اپنا کام کرا کے کچھ نہ کچھ دے دلا کر ہی جاتا تھا - (اِلّا ماشاءاللہ) — میں نے معذرت کر کے اور یہ سُنے بغیر کہ وہ کیا کہتا ہے — پاسپورٹ اور ویزا پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے - ایک زوردار اباؤٹ ٹرن (ABOUT TURN) لیا - باہر سے ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے یہ جا وہ جا —

راستہ میں ڈاکٹر صاحب کو صورتحال بتا دی کافی دُور جا کر پیچھے مُڑ کر بھی دیکھ لیا کہ کسی آئی - ڈی کے دفتر کا کوئی شخص واقعی پیچھا تو نہیں کر رہا — اس لئے کہ ان لوگوں سے بعید نہیں کہ پیسہ نہ ملنے پر کچھ نقصان پہنچانے پر نہ تُل جائیں — راستہ میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ واپسی کا اندراج کرانے کے لئے اب کمرہ میں میں نہیں جاؤں گا آپ جائیں گے - میں گیا تو وہ کمبخت پہچان لے گا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے جیسے کہے گا کہ "میاں جی - اب آگئے قابو میں، اب بچ کر کہاں جاؤ گے" — ڈاکٹر صاحب نے کمالِ بے نیازی سے فرما دیا کہ اچھا دیکھا جائے گا -

کراچی کے لئے ہماری واپسی کی سیٹ سینچر ۲۴ جنوری کے لئے بُک تھی - ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ اس سے پہلے کی سیٹ مِل جائے تو ہم جلد واپس چلے جائیں - چنانچہ سی - آئی - ڈی - آفس سے ہم پہلے تو انڈین ایرویز کارپوریشن کے دفتر گئے جمعہ کو ۱۲ بجے کراچی کے لئے فلائٹ تھی لیکن وہ بھی (CHANCE) چانس پر تھی - ہم نے سوچا کہ اس صورت میں کچھ پتہ نہیں سیٹ ملے کہ نہیں ملے اور دوسرے یہ کہ جمعہ کی نماز بھی نکل جائے گی - اس لئے اس کا خیال چھوڑ کر ہم یہاں سے پی - آئی اے - کے دفتر گئے - یہ دفتر یہاں کی ایک بہت اُونچی عمارت (OBEOI TOWER) میں واقع ہے - گراؤنڈ فلور پر چھوٹا سا دفتر ہے - تھوڑا سا اسٹاف ہے - دفتر کے دروازہ پر پی - آئی - اے - کی چھوٹی سی تختی لگی ہے - نئے آدمی کے لئے دفتر تلاش کرنے میں کچھ دقت ہوتی ہے - اگر صدر دروازہ (MAIN GATE) پر بھی پی - آئی - اے کی ایک تختی لگا دی جائے اور اُس پر دفتر کا کمرہ نمبر (اور تیر کا نشان) لگا دیا جائے تو بہتر ہو - بمبئی میں پی - آئی - اے - کا دفتر دیکھ کر خوشی ہوئی - یہ ایسے ہی ہے جیسے دیارِ غیر میں بہت عرصہ بعد کسی ہم وطن سے ملاقات ہو جائے — سینچر سے قبل سیٹ کا ہم نے یہاں سے بھی معلوم کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی — مجبوراً سینچر کی سیٹ ہی کی دوبارہ تصدیق (RE-CONFIRM) کرالی -

دوپہر تک قیام گاہ واپس آگئے - قریب ہی بھنڈی بازار کے چوک میں شالیمار ہوٹل کے نام سے ایک اوسط درجہ کا ہوٹل تھا، وہاں پر کھانا کھایا — اور ظہر کی نماز پڑھ کر اپنی قیام گاہ میں آکر آرام کیا — عصر سے قبل جماعت اسلامی

کے کچھ رفقاء ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کو ہماری قیام گاہ پر تشریف لاتے ۔ تھوڑی دیر گفتگو رہی ۔ ان حضرات کو ڈاکٹر صاحب کا تعارف شمس پیرزادہ صاحب سے ہوا تھا ۔ عصر کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب تو قیام گاہ پر آگئے اور میں دفتر جماعت اسلامی چلا گیا جو ابراہیم رحمت اللہ روڈ پر قریب ہی کی ایک عمارت میں واقع ہے ۔ چھوٹا سا دفتر ہے ۔ یہاں پر امیر صوبہ مہاراشٹر جناب رشید عثمانی صاحب اور دیگر رفقاء سے ملاقات ہوئی ۔ پاکستان میں ہم جس طریق پر کام کر رہے ہیں اُس کا میں نے اجمالی تعارف کرایا ۔ صوبہ کے ایک شہر مالیگاؤں کی جماعت کے رکن عبدالاحد صاحب بھی آئے ہوئے تھے اور یہاں موجود تھے ۔ اُن سے معلوم ہوا کہ مالیگاؤں میں اب بھی مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں کی جماعت خاصی مضبوط ہے ۔

مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب اور میں شمس پیرزادہ صاحب سے ملاقات کے لئے اُن کے دفتر گئے ۔ یہ ملاقات عشاء تک جاری رہی اور بہت سے مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی ۔ بعد عشاء شالیمار ہوٹل میں کھانا کھا کر واپس اپنی قیام گاہ آئے ۔ کچھ دیر مطالعہ کیا اور پھر سو گئے ۔ (جاری ہے)

بقیہ ، کربلا کی کہانی

صورت کے کہ یزید دینِ الٰہی سے نکل جائے ۔ پھر اس شخص نے دوبارہ کہا تو یزید نے اُسے ڈانٹ دیا ۔

اس کے بعد یزید نے ان سب کو محل سرا میں بھیج دیا ۔ پھر ان کو تیار کرا کے مدینہ روانہ کروا دیا ۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو خاندانِ عبدالمطلب کی ایک عورت سر پیٹتی اور روتی ہوئی ان سے ملنے کے لیے آئی ۔ اور اس کی زبان پر یہ اشعار تھے ؎

ماذا تقولون ان قال النبی لکم　　ماذا فعلتم وانتم اٰخر الامم

بعترتی وباھلی بعد مفتقدی　　منھم اُساری وقتلیٰ ضرجوا بدم

ماکان ھذا جزائی اذ نصحت لکم　　ان تخلفونی لبشر فی ذوی رحمی

ماخوذ از ہفت روزہ "الاسلام" لاہور

ہر مُسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

① ـــــ ایمان و تعظیم ـــــ یہ کہ اُسے مانے

② ـــــ تلاوت و ترتیل ـــــ یہ کہ اُسے پڑھے

③ ـــــ تذکّر و تدبّر ـــــ یہ کہ اُسے سمجھے

④ ـــــ حکم و اقامت ـــــ یہ کہ اُس پر عمل کرے

⑤ ـــــ تبلیغ و تبیین ـــــ یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے
جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

ڈاکٹر اسرار احمد

ہجری سالِ نو مُبارک

۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جمعہ کا دن اور محرّم الحرام ۱۴۰۲ھ کی یکم تاریخ تھی - اس روز مسجد دارالسّلام، باغ جناح، لاہور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطابِ جمعہ میں جو موضوع گذشتہ دو ماہ سے چل رہا ہے۔ (یعنی "نظام سیاست وحکومت سے متعلق قرآنی تعلیمات) اُس پر گفتگو سے قبل نئی ہجری سال کے آغاز کی مناسبت سے جو کچھ فرمایا وہ درج ذیل ہے (مرتّب)

نحمدہٗ وَ نصلّی علیٰ رسولہ الکریم - اما بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
قال اللہ عزّ وجلّ فی سُورۃ البقرہ :- وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (۱۵۴)
وقال تبارک وتعالیٰ فی سُورۃ آلِ عمران :- وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ (۱۶۹)
اما بعد :- رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝
اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ -
اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ
آمین یا ربّ العٰلمین ۝

حضرات! آج یکم محرم الحرام سن ۱۴۰۲ ہجری ہے۔ گویا آج پندرھویں صدی کے دوسرے سال کا پہلا دن ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو میں اسلامی تقویم کے اعتبار سے اس نئے سال کی آمد پر آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سال ہمارے لئے امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کا سال ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آغاز میں وہ دُعاء پڑھی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ کے نئے چاند کے طلوع ہونے پر پڑھا کرتے تھے یعنی "اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ" ۔ جس کے آخر میں آں حضرتؐ یہ بھی فرمایا کرتے تھے "رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ - ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ - ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ" ۔ اس دُعاء کے تین حصے ہیں۔ اصل دُعاء تو پہلا حصہ ہے کہ "اے اللہ! اس چاند کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرمایا۔" دوسرے حصے میں چاند سے خطاب ہے۔ اس میں دراصل اُن مشرکانہ اوھام اور عقائد کی نفی اور ابطال ہے جو چاند، سورج اور اجرامِ فلکیہ کے بارے میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔

لہٰذا آں حضرتؐ یہ فرمایا کرتے تھے "رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ" یعنی "میرا ربّ بھی اللہ ہے اور اے چاند تیرا ربّ بھی اللہ ہے" ۔ تیسرا حصہ ایک نوید اور خوشخبری بھی ہے اور اس میں ایک دُعائیہ پہلو بھی ہے۔ "ھِلَالُ رُشْدٍ وَّخَیْرٍ" "یہ ہلال جو طلوع ہوا ہے یہ رشد اور خیر کا ہلال ہے" یہاں "ہے" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے اور "ہو" بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اگر اوّل الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ نوید و خوش خبری ہے اور اگر موخر الذکر ترجمہ کیا جائے تو یہ دُعاء، ایک تمنّا اور ایک خواہش کا اظہار ہے ۔ کل جو ہلال طلوع ہوا ہے اس سے صرف ایک نیا مہینہ ہی شروع نہیں ہوا بلکہ نیا اسلامی و ہجری سال بھی شروع ہوا ہے لہٰذا ہمیں یہ دُعا کرنی چاہیئے کہ اے اللہ اس سال کو نوعِ انسانی کے حق میں بالعموم اور مسلمانانِ عالم کے حق میں بالخصوص اور اس خطۂ ارضی کے حق میں جو تُو نے اسلام کے نام پر ہمیں عطا فرمایا تھا۔ اور جو مملکتِ خداداد پاکستان، کہلاتا ہے خاص الخاص طریق پر اپنے فضل اور اپنی رحمت سے امن و سلامتی کا سال بنا

اور اس سال میں ہمارے ایمان اور اسلام میں حقیقی رنگ پیدا فرما۔ میں نے مزید یہ دُعا بھی کی ہے کہ اس سال کے دوران تیرے علم کامل میں جن کی وفات کا وقت آرہا ہو اے اللہ! ان کو ایمان پر وفات دیجیو اور جن کے لئے تیرے علم ازلی میں مزید مہلتِ عمر طے ہو ان کو اسلام پر قائم رکھیو۔ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ۔

اس موقع پر ایک جملہ معترضہ کے طور پر مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ محرم الحرام کے مہینے کو ہم نے ایک مخصوص مکتب فکر کے زیرِ اثر بلا سبب اور قطعی نامناسب طور پر رنج و غم اور حزن و الم کا مہینہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ کسی بھی اعتبار سے یہ مہینہ ہمارے لئے رنج و غم کا مہینہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سال کا کوئی مہینہ بھی دینی لحاظ سے رنج و الم کا مہینہ نہیں ہے۔ یوم عاشورہ (۱۰ محرم الحرام) کی جو اہمیت ہمارے ہاں ہے۔ اس میں ہمارے دینی تصورات و عقائد کے لحاظ سے غلط کا پہلو ہے۔ اس ضمن میں بہت سی احادیث صحیحہ کتب حدیث میں موجود ہیں۔ نبی اکرم صلّے اللہ علیہ وسلّم اس دن جو روزہ رکھتے تھے تو اس کی کوئی بنیاد اور تعلق حادثہ کربلا سے نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی الرفیق الاعلیٰ کی جانب مراجعت کے نصف صدی سے بھی زائد بعد پیش آیا ہے۔ لہٰذا دینی لحاظ سے اس حادثے کا یوم عاشورہ سے کسی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوم عاشورہ کے متعلق جو متفق علیہ حدیث ملتی ہے یعنی سند کے اعتبار سے جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جلیل القدر محدثین اتفاق کر رہے ہوں اور جس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن حضرت عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما — جو آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ دونوں کے چچازاد بھائی ہیں اور جو گویا حضرات حسنین رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے رشتے کے چچا بھی ہیں اور نانا بھی۔ وہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب آں حضرتؐ مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپؐ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود ۱۰ محرم الحرام کو روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے یہود سے دریافت فرمایا کہ تم یہ روزہ کیوں رکھتے

ہو"! تو انہوں نے بتایا کہ "یہ دن ہمارے لئے بڑی خوشی کا دن ہے، اس لئے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو آل فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی تھی اور فرعون اور اس کے اس لشکر کو جو تعاقب میں تھا غرق کیا تھا۔ لہٰذا ہم شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھتے ہیں"۔ اس پر آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تمہاری نسبت (حضرت) موسیٰؑ کے ہم زیادہ حق دار ہیں"۔ یعنی یہود نے تو اس کو ایک قومی دن کا درجہ دے رکھا ہے حالانکہ یہ تو دینِ اسلام کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور دینِ اسلام کی تاریخ تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ اسی موقع پر آنحضورؐ نے فرمایا کہ "ہم اس دن کا روزہ رکھنے کے زیادہ حق دار ہیں"۔ چنانچہ اس وقت سے آں جنابؐ نے دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا شروع فرما دیا۔

ویسے بھی اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارے دین میں 'شہادت' کا معاملہ کوئی رنج و غم والی بات ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک مردِ مومن کے لئے فوز و مرام اور فلاح و کامرانی کا بلند ترین اور ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ دلیل کیلئے سورہ البقرہ کی آیت ۱۵۴ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ "یعنی جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مُردہ نہ کہو، بلکہ یہ لوگ (تو حقیقت میں) زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور حاصل نہیں ہوتا"۔ اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۹ "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝" یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے روزی پا رہے ہیں"، کو پیش نظر رکھیئے۔ ان مقتولین کی برزخی زندگی میں حیات اور اُس میں رزق پانے کی کیفیات امورِ غیب سے متعلق ہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی تصور و شعور اس عالمِ ناسوتی میں ہمارے لئے ممکن نہیں۔

شہادت فی سبیل اللہ وہ سعادتِ عظمیٰ اور چوٹی کا وہ عمل ہے کہ جس کے لئے انبیاء و رسول علیہم السلام تمنّا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دُعائیں منقول ہیں - ایک یہ کہ اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ - اور دوسری یہ کہ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ -

مزید براں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی احادیث میں منقول ہے:

"وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ أَغْزُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَأُقْتَلَ ثُمَّ أَغْزُوَ فَأُقْتَلَ — " اس (اللہ) کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے - میری آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں (اور پھر مجھے زندہ کیا جائے) اور پھر میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں —" یہ سنّت رہی ہے کہ رسول قتل نہیں ہوتے چونکہ عالم ظاہری میں اس طرح رسُول کی مغلوبیت کا پہلو نکلتا ہے - لیکن اس سے مرتبہ شہادت کے رفیع و مہتم بالشان ہونے کا اندازہ لگا لیجئے — علاوہ ازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی سن لیجئے کہ "جس مسلمان کی موت اس حال میں آئی کہ اس کے دل میں راہ حق میں سر کٹا کر سرخرو ہونے کی تمنا و آرزو نہ ہو، اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوئی "- پس شہادت ہرگز رنج والم سوگ اور ماتم کرنے والی چیز نہیں ہے -

اگر شہادت رنج و غم اور الم و ماتم والی شے ہوتی تو دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی عظیم شہادت وقوع پذیر نہ ہوئی ہو - اگر شہادت میں رنج و غم اور ماتم کا پہلو تلاش کریں تو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی شہادت کا دن بھی ماتم کے دن کے طور پر منانا ہوگا - یہ بڑی عظیم شہادت ہے - توحید کے لئے یہ پہلا خون بہا ہے - جس سے مکہ مکرمہ کی زمین لالہ زار ہوئی ہے اور کس بہیمانہ طریقے پر کہ ابوجہل نے تاک کر اندام نہانی پر نیزہ مارا ہے جو پشت کے پار ہو گیا ہے - پھر ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی عظیم شہادت ہے - جس کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل اور اس کے شقی القلب ساتھیوں نے حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیوں سے باندھے پھر چار سمت میں چار اونٹ کھڑے کر کے یہ رسیاں ان اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ کر ان کو

ہانک دیا گیا اور حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے - یہ شوہر اور بیوی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں اس ظالمانہ طور پر شہید کئے گئے — ان کی مظلومانہ شہادت کے واقعات ایک حساس دل کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر ہمیں سوگ اور ماتم کا دن منانا ہوتا تو ان کا مناتے ! اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی بنیاد پر شہادت کا دن نوحہ و گریہ اور ماتم کا کوئی پہلو رکھتا تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت کا دن اس کا کہیں زیادہ مستحق ہوگا کہ اسے سوگ کا دن منایا جائے !! جن کے اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت داری کے تہرے بلکہ چوہرے رشتے ہیں - چنانچہ چچا بھتیجے کا رشتہ بھی ہے - خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور رضاعی بھائی بھی ہیں عرب میں رضاعت کا رشتہ بالکل خونی رشتے کے برابر سمجھا جاتا تھا چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کی حرمت جس طرح رحم اور خون کے رشتوں کی بنیاد پر ہے اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر بھی ہے - پھر ساتھ کے کھیلے ہوئے ہمجولی ہیں۔ مزید اضافہ کیجئے کہ نبی اکرمؐ کے فرمانِ مبارک کے مطابق اسد اللہ بھی ہیں اور اسدُ رسولہٖ بھی ہیں — پھر نعشِ مبارک کا حال یہ ہے کہ اعضا بریدہ (مثلہ شدہ) ہیں، شکم چاک ہے - کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی گئی ہے - اب اگر ہر سال سوگ کا دن منایا جاتا اور ماتم کیا جاتا تو ان کی شہادت کا کیا جاتا !!! پھر دیکھئے کہ حضرت زید بن حارثہؓ حضرت جعفر طیار ابن ابی طالب حضرت عبداللہ ابن رواحہ حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالےٰ عنہم اور بے شمار دوسرے جان نثارانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم دورِ نبوت میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ سوگ کا دن منایا جاتا تو ان کا منایا جاتا — لیکن رنج و غم کی بات کون سی ہے !! - اسلام کی تاریخ کا کون سا دور ہے جو ان شہادتوں اور ان قربانیوں سے خالی ہو - اسلام کے گلشن میں ہر چہار طرف یہ پھول کھلے ہوئے ہیں — پھر غور فرمائیے کہ اسلامی تقویم کا جو پہلا دن ہر سال آتا ہے یعنی یکم محرم الحرام تو یہ ایک عظیم شہادت کا دن ہے - یعنی دوسرے خلیفۂ راشد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت کا دن یکم محرم الحرام

ہے۔ وہ عمرؓ جن کے متعلق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے"۔ اگر رنج و غم کے اظہار کا مسئلہ ہوتا اور اگر سوگ کا دن منانے کا معاملہ ہوتا تو آج کے دن ہوتا۔ حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ۲۸، ذی الحجہ کو ہوا تھا جس میں آں جنابؓ مجروح ہوئے تھے اور معتبر روایات کے مطابق ان کی وفات یکم محرم الحرام کو ہوئی تھی۔ پھر ۱۸، ذی الحجہ کو تیسرے خلیفہ راشد، ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد انتہائی مظلومانہ طور پر شہید کئے گئے۔ جن کی شہادت کے نتیجے میں مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوئے۔ اور اُمت میں ایسا تفرقہ پڑا کہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو اس "شہید مظلوم" کی شہادت کے دن کو منایا جاتا۔ پھر ۱۷، رمضان المبارک کو اسد اللہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضورؐ کے چچیرے بھائی، آپؐ کے داماد، چوتھے خلیفہ راشد شہید کر دیئے گئے جو حضرات حسنین رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے والد ماجد بھی ہیں۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو ایک مخصوص مکتب فکر کے افراد کے بجائے پوری اُمت آں جنابؓ کی شہادت کے دن سوگ مناتی۔ اگر سوگ کے دن منانے کا سلسلہ جاری رہے تو بتایئے کون کون سے دن سوگ منایا جائے گا! سال کا کون سا دن ہوگا جو کسی نہ کسی عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کی شہادت کا یا وفات کا دن نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین میں سوگ اور ماتم اور ان کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جس گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہو تو سوگ کی کیفیت کی زیادہ سے زیادہ تین دن کے لئے اجازت ہے۔ اُس میں بھی نوحہ گریہ اور سینہ کوبی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان میں سے جنہوں نے بھی اللہ کی راہ میں قربانیاں دی ہیں اور حق و صداقت کے لئے اپنی جانیں دی ہیں اُن کی بنیاد پر ان کا بہت ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ لیکن نہ دن اور یادگار منانا ہمارے دین کے مطابق ہے اور نہ یہ کوئی رنج والم اور غم و حزن کا معاملہ ہے اور نہ ہر سال سوگ اور ماتم کرنا دین سے کوئی مناسبت

رکھتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے صوفیائے کے ہاں موت کو ایک محبوب اور محب کی ملاقات کا وقت تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ جو لفظ 'عرس' رائج ہے تو اس کی اصل 'عروسی' ہے۔ جیسے 'عروسی' (شادی) ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے ویسے ہی موت کسی مردِ مومن کے لئے کسی رنج و غم کا موقع ہے ہی نہیں، چاہے وہ طبعی ہو چاہے قتل کی صورت میں ہو۔ یہ تو درحقیقت ایک محبوب اور محب کی ملاقات ہے اس پہلو سے علامہ اقبال کا وہ شعر ذہن میں رکھیئے کہ ؎

"نشانِ مردِ مومن باتو گویم ——— چوں مرگ آید تبسّم برلبِ اوست!"

تو تبسّم خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی کے موقع پر۔ پس یہ سوگ اور ماتم کے دن منانا قطعًا ہمارے دین کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے معاشرے میں یہ غلط رواج چلا آرہا ہے کہ محرم الحرام بالخصوص اس کے پہلے عشرے میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے آخری عشرے میں شادیوں کا ایک طوفان آجاتا ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ امسال ذی الحجہ کے آخری دنوں میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں شادیاں انجام پائی ہیں۔ آخر ہم نے محرم الحرام بالخصوص اس کے پہلے عشرے کو شادی بیاہ کی تقریب کے لئے حرام یا منحوس کیوں سمجھ لیا ہے!! ۔ چونکہ میرے نزدیک ان غلط رواجات و روایات کو توڑنا اور غیر اسلامی تصوّرات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک نوع کا جہاد ہے۔ لہٰذا نوٹ فرما لیجئے کہ اسی ماہ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی ۷ تاریخ کو بعد نماز مغرب ان شاء اللہ میرے دوسرے بچے عاکف سعید سلّمہ کا عقدِ نکاح مسنونہ جامع مسجد قرآن اکیڈمی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن میں منعقد ہوگا۔ جس میں شمولیت کی میں آپ تمام حضرات کو دعوت دیتا ہوں۔ آپ حضرات کی تشریف آوری اور دُعائے خیر میں شرکت میرے لئے باعثِ مسرت و ممنونیت ہوگی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین۔

(طبعِ مکرّر ـــ از ماھنامہ "میثاق" بابت محرّم الحرام ۱۴۰۲ھ)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قال اللہ تبارک وتعالیٰ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(آل عمران: ۳۱)

شادی بیاہ کی تقریبات

کے ضمن میں

اتباعِ نبویؐ پر مبنی

ایک اصلاحی تحریک

از

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، وامیر تنظیم اسلامی

۲۷ر اگست جمعرات کو بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر صاحب کی تیسری بچی کا عقد نکاح "جامع القرآن" میں منعقد ہوا - اس تقریب کے سلسلے میں ملک کے نامور صحافی جناب م-ش نے اپنے مقبول و معروف کالم "م-ش کی ڈائری" میں نوائے وقت کی ۳۰ر اگست ۸۱ء کی اشاعت میں جن تأثرات کا اظہار کیا اور پاکستان ٹائمز میں اس تقریب کی جو رپورٹ شائع ہوئی وہ درج ذیل ہیں ———— (جمیل الرحمن)

"ایک ٹن وعظ کے مقابلے میں ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے"

"ایک ٹن وعظ کے مقابلے پر ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے - اس اصول کا عملی مظاہرہ گزشتہ جمعرات کو دارالقرآن ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں اس وقت ہوا - جب مشہور عالم دین اور مفسر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی بیٹی کی شادی کی جملہ تقریبات عین سنّت نبویؐ کے مطابق انجام دے کر ایک عملی مثال قائم کی - میں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے ہزاروں کی تعداد میں مواعظ حسنہ میں شرکت کی ہے - لیکن اس موقع پر میری رُوح نے ان کی تقریر دل پذیر کے جو اثرات قبول کئے وہ انمٹ تھے -

نماز مغرب کے وقت مسجد کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا تھا - امامت کے فرائض ڈاکٹر اسرار احمد نے انجام دیئے - قرآن پاک کی آیات مبارکہ تلاوت کرنے میں ان کے لحن میں سوز داؤدی ابھر آیا تھا - نماز سے فارغ ہوئے تو ایک مختصر تقریر میں جہیز اور ولیمہ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا - پھر خطبہ نکاح پڑھا اور بس انکی بیٹی سلمہا بیاہی گئیں اور یہ تقریب درود و صلوٰۃ کے درمیان اختتام پذیر ہوئی -

ہمارے ہاں شادی، بیاہ، موت اور ختنہ وغیرہ کی تقریبات ایک ہنگامہ ایک مسلسل دردِسر اور اسراف بیجا کا نشان بن چکی ہیں - ہزاروں مساجد، ریڈیو اور ٹیلیویژن سے کم و بیش روزانہ امام صاحبان اور مقرر حضرات اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان تقریبات سے متعلق بدعتوں کے خلاف دھواں دھار تقاریر کرتے ہیں - لیکن عمل کے لحاظ سے کوئی شخص ٹس سے مس نہیں ہوتا، ہنگاموں، دردِسر اور اسرافِ بیجا کا عمل غیر مختتم طور پر جاری رہتا ہے لیکن پاکستان میں کم از کم ایک بندۂ خدا نے قول و فعل کے تضاد سے بچتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ میں

دعا کرتا ہوں کہ اس پر گامزن ہونے کی ہر پاکستانی کو توفیق ارزاں ہو - آمین -
ڈاکٹر اسرار احمد خدا کے فضل و کرم سے بھلے چنگے کھاتے پیتے آدمی ہیں اگر وہ چاہتے تو اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب پر ڈھول ڈھمکے، باجے گاجے آتشبازی اور بجلی کے قمقموں کا جس پیمانے پر چاہتے اہتمام کر سکتے تھے - ان کے ایسے نیازمند ہیں جو ان کے ایک ادنیٰ اشارے پر کھانے پینے کے لئے ہر قسم کی پُرتکلف اشیاء فراہم کر سکتے تھے لیکن اس بابرکت تقریب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سنتِ نبویؐ سے سرمو انحراف نہ فرمایا اور یہ تقریب اس حسن و جمال خیر خوبی سے اختتام پذیر ہوئی کہ اس کا لطف زندگی بھر فراموش نہ ہو سکے گا - (بقیہ آخری صفحے پر دیکھئے !)

AN AUSTERE MARRIAGE

(Report by staff Reporter appeared in PAKISTAN TIMES Lahore insertion of 29th August 1981.)

"Unique and commendable austerity, true to the traditions of the Holy Prophet (peace be upon him) was observed at a marriage function in Jamia - ul - Quran, Quran Academy Model Town Lahore on Thursday evening

No pomp and show, guests were not served with any refreshment. People assembled in the jamia a few minutes before evening prayers, before the 'Azan' they quietly listened to the cassette recording of the Holy Quran After prayers, Dr. Israr Ahmad, a renowned religious scholar, performed the 'Nikah' ceremony of Mr. Saeed Ahmed Asad with his daughter - "Amatul Mohsee" Nikah ceremony over, the bridegroom with relations and friends left quietly. Dr. Israr told that for observing this austerity many of his relations had severed with him and members of his family."

شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک

ڈاکٹر اسرار احمد

جمعرات ۲۷ اگست ۸۱ء کی شام کو میری تیسری بچی کا عقدِ نکاح اپنے چچازاد کے ساتھ بفضلہ تعالیٰ بخیر وخوبی انجام پایا - اس تقریب کی مختصر روداد یہ ہے کہ اس کے لئے میں نے صرف ایک اخباری اعلان پر اکتفا کیا تھا[1] جس میں یہ صراحت بھی موجود تھی کہ اس موقع پر کسی خورد و نوش کا کوئی اہتمام نہیں ہوگا - اپنے قریب ترین اعزہ میں سے بھی کسی کو میں نے تعین کے ساتھ (BY NAME) مدعو نہیں کیا تھا - مغرب کی نماز سے آدھ گھنٹہ قبل 'جامع القرآن' یعنی قرآن اکیڈمی (۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور) کی جامع مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر مصری قرأت کا ایک ریکارڈ لگا دیا گیا - مہمان آتے رہے اور نہایت ادب اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر استماعِ قرآن میں مشغول ہوجاتے رہے - اسی خاموشی کے ساتھ دولہا اور اس کے ساتھ والے لوگ بھی آئے اور بیٹھ گئے - بعدازاں نماز ہوئی جس کے بعد میں نے پندرہ بیس منٹ خطاب کیا، پھر خطبۂ نکاح پڑھا اور خود ہی ایجاب وقبول کا مرحلہ طے کرا دیا مزید براں حاضرین کی جانب سے خود ہی اپنے آپ کو مبارکباد دے کر اور خود ہی اُسے قبول کر کے مجلس کے خاتمے کا اعلان کر دیا تاکہ کسی تاخیر کے بغیر معمول کے مطابق درسِ قرآن شروع ہوسکے - بعدازاں کوئی پانچ سات منٹ چھوہاروں کی تقسیم میں لگے اور اس کے بعد درسِ قرآن کا آغاز ہوگیا ــــ بچی بھی مہمان خواتین کے ہمراہ مسجد کے زنانہ ہال میں موجود تھی، اُسے وہیں سے اُس کے بڑے

[1] اس لئے کہ میرے نزدیک دورِ حاضر میں نبی اکرمؐ کے فرمانِ مبارک :- "اَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ" (نکاح کا اعلانِ عام کیا کرو!) پر عمل کی موزوں ترین صورت یہی ہے !!

بھائیوں نے دولھا کے ساتھ رخصت کر دیا - اور اس طرح یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔
اس پر انگریزی روزنامے "پاکستان ٹائمز" نے بھی "AN AUSTERE MARRIAGE) کا چوکھٹا نمایاں طور پر لگایا — اور جناب م۔ش نے تو اپنی ڈائری میں رنوائے وقت ۳۰ راگست ۱۹۸۱ء) مجھے خوب ہی کانٹوں پر گھسیٹا اور "ایک ٹن وعظ کے مقابلے میں ایک اونس عمل زیادہ وزنی ہوتا ہے!" کی سرخی جمائی — اب جب کہ اس طور سے "رسوائی" ہو ہی گئی ہے اور یہ معاملہ لوگوں کے علم میں آ ہی گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کسی قدر مزید تفصیل سے روشنی ڈال دی جائے - کیا عجب کہ اس سے لوگوں کو کوئی عملی رہنمائی حاصل ہو جائے!

شادی بیاہ کی تقریبات اور لوازمات و رسومات کے روز افزوں طومار نے جس طرح ایک سماجی برائی کی شکل اختیار کر لی ہے اس کا شدید احساس ہر صاحبِ نظر اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے انسان کو ہے - امیروں کے لئے تو یہ تقریبات و رسومات صرف "چونچلوں" یا پھر اپنے "کالے دھن" کے نمائش و اظہار کے ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں - لیکن عوام کی اکثریت کے لئے یہ ناقابلِ برداشت بوجھ یا بالفاظ دیگر پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق بن گئی ہیں - جن کے باعث شادی میں تاخیر ہوتی ہے اور اس 'ام الخبائث' (شادی کی تاخیر) کے بطن سے اخلاقی اور نفسیاتی امراض کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم پاتا چلا جاتا ہے -

قرآن حکیم میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بلند و بالا شانیں بیان ہوتی ہیں - ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو ناقابلِ برداشت بوجھوں اور ان طوقوں سے نجات دلائیں گے جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوں گے' (وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ) لہٰذا آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہش اور آپؐ کے طریقِ کار پر عمل پیرا ہو کر معاشرے کی اصلاح کا داعیہ رکھنے والوں کا فرضِ عین قرار پاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان بوجھوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں خواہ اس میں ان کو کیسی ہی تکالیف اٹھانی پڑیں اور کتنی ہی مشکلات کا سامنا ہو -

اس ضمن میں جہاں تک 'سادگی' کے وعظ کا تعلق ہے تو وہ تو عام طور پر کہنے اور سننے میں آتا ہی رہتا ہے اور بسا اوقات دقتی اور فوری طور پر اس کا اثر بھی سامعین شدت سے محسوس کرتے ہیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی عملی اثر مرتب نہیں ہوتا - اس کی وجہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے — یعنی "سادگی" ایک مبہم اور اضافی لفظ ہے جس کا کوئی معین مفہوم نہیں ہے - غرباء کے لئے اس لفظ کے معنی کچھ اور ہیں اور امراء کے لئے بالکل اور !! تو جس اصلاحی کوشش کی بنیاد ایسے مبہم اور غیر معین تصور پر ہوگی اس کا حاصل و نتیجہ پیشگی ظاہر ہے -

راقم الحروف کو اس مسئلے کے ساتھ عملی سابقہ اوّلاً اُس وقت پیش آیا جب ۱۹۶۶ء میں راقم نے لاہور میں 'دعوت رجوع القرآن' کا آغاز کیا اور درس و مطالعۂ قرآن حکیم کے حلقے قائم کئے - ان حلقوں کے ذریعے جو لوگ راقم کے قریب آئے، ان میں فطری طور پر راقم کے ساتھ حسن ظن اور ایک گونہ عقیدت، پیدا ہونی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ 'نکاح خوانی' کی فرمائشیں بھی آنی شروع ہوئیں - ابتدا میں تو میں نے اس سے احتراز کرنے کی کوشش کی لیکن جب فرمائشوں نے تقاضوں اور مطالبوں کی صورت اختیار کی تو چار و ناچار گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور اپنے رفقاء و احباب کے بچوں اور بچیوں کے نکاح پڑھانے کا سلسلہ شروع کرنا پڑا -

اس سلسلے میں اوّلین بات تو میرے سامنے یہ آئی کہ ہم نے 'خطبۂ نکاح' کو محض "جنتر منتر" بنا کر رکھ دیا ہے - حالانکہ خطبے کی اصل غرض و غایت، تذکیر و نصیحت ہے - یہی وجہ ہے کہ علماء کو 'خطبۂ جمعہ' کے ساتھ "خطاب جمعہ" کا اضافہ کرنا پڑا تاکہ خطبۂ جمعہ کی اصل غرض و غایت اگر خود اس سے حاصل نہ ہو رہی ہو تو عربی زبان کے مقولے "مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ" کے مطابق اُس سے یکسر محرومی قبول نہ کی جائے بلکہ اُسے اضافی خطاب جمعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے - چنانچہ اسی اصول کے تحت میں نے 'خطبۂ نکاح' سے قبل 'خطاب' کا سلسلہ شروع کیا جس میں ان آیات و احادیث کی مختصر

تشریح بھی ہوتی تھی جو نکاح کے مسنون خطبے میں شامل ہیں اور کچھ عمومی دعوت و نصیحت بھی ہوتی تھی۔ اور خاص طور پر حدیث مبارکہ "اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ" کے ضمن میں جہاں رہبانیت کی نفی ہوتی تھی وہاں سنّت کا وسیع تر تصور بھی سامنے رکھا جاتا تھا اور آخر میں نہایت زور دے کر کہا جاتا تھا کہ "اتباعِ سُنّت" کے پہلے قدم کے طور پر کم از کم شادی بیاہ کی تقریبات اور رسومات کے ضمن میں تو ہمیں بیٹھ کر ہی لینا چاہیئے کہ ان میں سے صرف وہی چیزیں باقی رکھی جائیں جن کا ثبوت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مل جائے اور باقی تمام بعد کی ایجاد کردہ یا باہر سے درآمد شدہ رسومات کو پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ پاؤں تلے روند دیا جائے[1]!! مثلاً یہ کہ نکاح مسجد میں ہونا چاہیئے۔ جہیز اور بری وغیرہ کی نمائش بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔ گھروں کی تزئین و آرائش اور بالخصوص روشنی وغیرہ پر اسراف سے بچنا چاہیئے۔ اور دعوتِ طعام صرف ایک ہونی چاہیئے۔ یعنی "دعوتِ ولیمہ"۔ لڑکی والوں کی جانب سے نکاح کے موقع پر دعوتِ طعام کا سلسلہ بالکل بند ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلسل پانچ چھ برس تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ لوگ یہ باتیں سُن کر نگاہیں نیچی کر لیتے تھے، فوری تاثر کے آثار بھی ان کے چہروں پر ظاہر ہوتے تھے۔ بعد میں بہت سے لوگ اس "وعظ" کی تائید و تصویب ہی نہیں تحسین بھی فرماتے تھے۔ لیکن جب موقع آتا تھا تو "زمین جنبد نہ جنبد گُل محمد" کے مصداق پر نالہ وہیں گرتا تھا اور بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ بیل گاڑی کا اس "لیک" سے ہٹنا تقریباً ناممکن ہے۔ تا آنکہ ۱۹۷۳ء کے اواخر میں میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کر کے واپس آ گئے اور ان کی شادی کا مرحلہ آیا۔ وہ ہم تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں گویا ہمارے خاندان کی اک نسل کی سطح پر یہ آخری شادی تھی۔ میں نے اس موقع پر ایک فیصلہ کن اقدام کا

---

[1] یہ بات بہت قابل توجہ ہے اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ "اصلاح الرسوم" کیلئے واحد ممکن اور ٹھوس بنیاد صرف اور صرف "اتباعِ سُنّت" کا اصول ہے اس کے سوا جو کوشش کی جائیگی وہ اُسی طرح غیر موثر ہو کر رہ جائے گی جس طرح "سادگی" کا وعظ!!

عزم کیا۔ اس لئے کہ میرے سامنے معاملے کی صورت یہ آئی کہ جو کچھ دوسروں کو بطور نصیحت کہتے رہے ہو اب یا تو خود اُس پر عمل کر کے دکھاؤ ورنہ ان باتوں کا کہنا چھوڑ دینا چاہیئے گویا بقول علامہ اقبال ع "یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر!"

خوش قسمتی سے جہاں رشتہ طے پایا تھا وہ خود بہت پختہ دینی مزاج کے حامل لوگ تھے۔ گویا اصل مسئلہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی حل کر دیا تھا۔ چنانچہ بحمد اللہ کوئی دقت پیش نہ آئی اور جوں ہی میں نے ان کے سامنے پورا معاملہ رکھا، انہوں نے برضا و رغبت آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں بعض دوسرے اعزّہ و اقارب نے معاملے کو سخت ردّ و قدح اور طعن و استہزا کا موضوع بنایا اور کسی قدر تلخی بھی پیدا ہو گئی تاہم بحمد اللہ یہ شادی ٹھیٹھ سنّتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق ہوئی اور اس طرح بفضلہ تعالےٰ 'CHARITY BEGINS AT HOME' والا معاملہ ہو گیا۔!

اس مرحلے پر پہلے اقدام کے طور پر راقم نے تین چیزوں پر زور دینے کا فیصلہ کیا ایک[1] یہ کہ نکاح مسجد میں منعقد ہو۔ دوسرے[2] یہ کہ لڑکی والوں کی طرف سے کوئی دعوتِ طعام نہ ہو اور تیسرے[3] یہ کہ 'بارات' کا تصوّر بالکل ختم کر دیا جائے۔ ان تینوں کی وضاحت کے ضمن میں جو مختصر تحریر راقم کے قلم سے نکل کر 'میثاق' لاہور کی اشاعت بابت فروری ۷۴ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں شائع ہوئی (اور جو بعد میں ایک علیحدہ چار ورقے کی صورت میں طبع ہو کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوئی) مِن وعَن درج ذیل ہے:۔

"۱۔ جہاں تک نکاح کی تقریب کے مساجد میں انعقاد کا معاملہ ہے وہ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس پر جلد ہی راضی ہو جاتے ہیں اس لئے کہ بات بڑی واضح ہے۔ چنانچہ بہت سے مواقع پر جب دو باتیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) اس ضمن میں کہی گئیں تو واقعہ یہ ہے کہ جملہ حاضرین کی پیشانیاں عرقِ ندامت سے نم ہو گئیں۔ اور ان کے چہروں پر حقیقی تأثر کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ ایک[1] یہ کہ جب تاجدارِ عالم اور محبوبِ ربّ العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر اور دخترِ نیک اختر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا نکاح مسجد میں ہوا تو ہم میں سے کون ہے جو اپنے آپ کو آنحضورؐ

سے زیادہ باعزت یا اپنی بیٹی کو سیدۃ نساءِ اہل الجنۃ سے افضل سمجھتا ہو اور اُسے مسجد میں نکاح پڑھوانے سے عار محسوس ہو؟ ——— اور دوسرے یہ کہ ہمیں شرم آنی چاہیئے کہ عیسائیوں نے، اس کے باوجود کہ ان کا اپنے مذہب سے لگاؤ نہ ہونے کے برابر ہے - تاحال کلیسا کا درجہ اس قدر بلند رکھا ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں نکاح کے لیئے وہاں حاضر ہوتے ہیں اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے مسجد کا مقام اس درجے گرا دیا کہ وہاں نکاح پڑھوانے کو عار جانتے ہیں حالانکہ شریعت نے واضح راہ کھول دی ہے کہ لڑکی کی طرف سے اس کا وکیل دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح خواں کو اجازتِ "ایجاب" دیتا ہے - اس طرح جب لڑکی کا خود مجلسِ نکاح میں موجود ہونا ضروری نہیں تو آخر اس کے گھر پر اس تقریب کا انعقاد کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے ——— راقم کے خیال میں یہ دونوں دلیلیں اتنی قوی اور موثر ہیں کہ اگر ان کو عام کر دیا جائے تو اکثر لوگ تقریبِ نکاح کے مسجد میں انعقاد پر برضا و رغبت آمادہ ہو جائیں گے - ویسے دو مزید دلیلیں جو یقیناً قابلِ لحاظ ہیں، یہ ہیں کہ اوّلاً نکاح کے بعد جو دُعائے خیر دُولھا اور دُلھن کے لیئے کی جاتی ہے اس کا بہترین ماحول مسجد میں ہوتا ہے نہ کہ شادی والے گھر کی ہنگامہ خیز فضا میں ——— اللہ کے کسی گھر میں کسی نماز کے معًا بعد یہ تقریب منعقد ہو اور اس کے بعد اس پاکیزہ ماحول میں نئے گھر کی آبادی اور خوش حالی اور دین و ایمان کی سلامتی اور باہمی اُلفت و محبت کی دُعا کی جائے تو اُمید واثق ہے کہ اس کی تاثیر کم از کم دہ چند ہو جائے گی اور ثانیاً یہ کہ اس سے شامیانوں، قناتوں، قالینوں، صوفوں اور کرسیوں اور رنگا رنگ کی آرائشوں پر صرف ہونے والا پیسہ بچ جائے گا جسے کسی اور نیک کام کے لیئے صرف کیا جا سکتا ہے -

۲ - نکاح کے موقع پر دعوتِ طعام سے احتراز کا معاملہ البتہ ذرا کڑوی گولی ہے جو آسانی سے حلق سے نہیں اترتی - لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ پہلے معاملے سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے -

اس سلسلے کی ایک دلیل تو خالص دینی اور مذہبی ہے - یعنی یہ کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلّم نے ہمیں زندگی کے ہر گوشے سے متعلق

مفصّل ہدایات دے دی ہیں - یہاں تک کہ ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ نے ہمیں استنجا اور طہارت تک کی بھی مفصّل تعلیم دی ہے تو کیا کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شادی بیاہ ایسے معاملات میں حضورؐ کی جانب سے معاذ اللہ کوئی کوتاہی رہ گئی ہے جس کی تلافی کی کوشش ہمیں خود کرنی ہے — ! اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کے ضمن میں دعوتِ ولیمہ کی تاکید فرمائی اور اس کی اس لازمی برائی کا ذکر کرنے کے باوجود کہ " بِئْسَ الطَّعَامُ الْوَلِيمَةِ يُدْعَى إِلَيْهِ الْأَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْمَسَاكِينَ " (یعنی دعوتِ ولیمہ بھی کیا ہی بُری دعوت ہے جس میں صاحبِ حیثیت لوگوں کو بُلایا جاتا ہے اور مسکینوں سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے) یہ مثبت حکم بھی دیا کہ " إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْوَلِيمَةِ فَلْيَأْتِهَا " (جب تم میں سے کسی کو ولیمے میں بُلایا جائے تو وہ ضرور جائے) ساتھ ہی مزید تہدید بھی فرمائی کہ " فَمَنْ لَمْ يَأْتِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ " (یعنی جو دعوت میں (بلا عذر) شریک نہ ہوگا اس نے (گویا) اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کیا) واضح رہے کہ یہ تمام حدیثیں 'مسلم شریف' سے ماخوذ ہیں۔

پس اگر نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کے یہاں بھی دعوتِ طعام کوئی اچھا کام ہوتا اور اس میں کوئی بھی خیر کا پہلو موجود ہوتا تو کیا اللہ کے رسولؐ ہمیں اس کا حکم نہ دیتے؟ — یا کم از کم درجہ استحباب ہی میں اس کا ذکر نہ فرماتے؟ اور جب اس کا کوئی ذکر ہمیں

— کسی حدیث میں نہیں ملتا تو کیا یہ ایک خواہ مخواہ کی بدعت نہیں؟ اور کیا یہ اُن اصر اور اغلال کے قبیل کی چیز نہیں جن کے بوجھ سے انسانوں کی گردنوں کا آزاد کرانا مقاصدِ نبوت میں شامل ہے؟

دوسری دلیل وہ ہے جو ہر صاحبِ عقلِ سلیم کو اپیل کرے گی، یعنی یہ کہ شادی کا موقع لڑکی والوں کے لئے ویسا کھلی خوشی کا موقع نہیں ہوتا جیسا لڑکے والوں کے لئے ہوتا ہے - لڑکے کے لئے یہ خانہ آبادی کا موقع ہوتا ہے

اور لڑکے والے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو رہا ہوتا ہے لہٰذا اصل خوشی وہاں ہوتی ہے (یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السّلام نے دعوتِ عرس کا حکم لڑکے ہی کو دیا!) — لڑکی کے والدین کو اس کی شادی کے موقع پر اگرچہ اس پہلو سے ایک احساس اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ ایک اہم فرض ادا ہو گیا اور ذمہ داری کا ایک بھاری بوجھ کاندھے سے اتر گیا لیکن صحیح معنیٰ میں اُن کے یا لڑکی کے بھائی بہنوں کے لئے یہ خوشی کا موقع ہرگز نہیں ہوتا بلکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ لڑکی کی رخصتی کے وقت سب اہل خانہ اشکبار ہوتے ہیں - گھر کا ایک فرد، ماں باپ کی لاڈلی اور ناز و نعم کی پلی ہوئی بچی، بہنوں اور بھابیوں کی پیاری، ماں جائی کا گھر سے رخصت ہونا ظاہر ہے کہ ہرگز خوشی کی بات نہیں — اس پر مستزاد ہیں مستقبل کے اندیشے جو ہر طرح کے حزم و احتیاط کے باوجود بہرحال بالکل ختم کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ کیا معلوم نباہ ہو یا نہ ہو اور بیل منڈھے چڑھے یا نہ چڑھے — ان حالات میں اس گھر پر اور ان ہی گھر والوں کے ہاتھوں قورمے اور متنجن اڑانا یقیناً بڑی ہی دناءتِ طبع اور سفلہ مزاجی کا معاملہ ہے - ایک غیرت مند اور باحمیّت انسان کے لئے یہ چیز، الّا آنکہ ذہن اِدھر منتقل نہ ہوا ہو، بڑی ہی قابلِ عذر ہے -

۳ - اب اگر یہ دونوں باتیں اظہر من الشمس ہیں : یعنی نکاح کی تقریب مسجد میں ہو اور اس موقع پر دعوتِ طعام کو پروگرام سے خارج (ELIMINATE) کر دیا جائے تو خود بخود "بارات" کا پورا تصوّر ہی ختم ہو جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ہے ہی ختم کئے جانے کے لائق بلکہ صد لائق! خدا کا شکر ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی احادیث کے پورے ذخیرے، یہاں تک کہ جتنی عربی راقم کو آتی ہے، کم از کم اس کی پوری لغت میں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ لفظ "بارات" کیا جا سکے اور جس طرح یہ لفظ خالص عجمی ہے اسی طرح اس کا پورا تصوّر بھی خالص عجمی ہے اور اس کا وہ نقشہ تو خالص ہندوانہ ہے جو ہمارے ذہنوں میں شادی بیاہ کے لوازم کی حیثیت سے رچ بس گیا ہے یہ ایک جتھے کی صورت میں جمع ہو کر اور باقاعدہ

"چڑھائی" کے انداز میں لڑکی والے کے گھر جانا اور پھر لڑکی کا ڈولا لے کر "فاتحانہ" انداز سے لوٹنا خالص ہندوانہ تصوّر ہے جس کی بیخ کنی لازماً کی جانی چاہیئے۔

بارات کا متذکرہ بالا تصوّر نہ صرف یہ کہ خالص عجمی ہی نہیں خالص ہندوانہ ہے بلکہ ذرا غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ بڑی کم ظرفی کا مظاہرہ بھی لئے ہوئے ہے۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ دندناتے ہوئے جانا اور لڑکی والوں پر پورا رعب جھاڑتے ہوئے بطرزِ استحقاق پلاؤ زردہ اڑانا اور پھر فاتحانہ شان میں "مالِ غنیمت" سے لدے پھندے واپس آنا! حیرت ہے کہ کیوں لوگوں کو محسوس نہیں ہوتا کہ ان چیزوں کی اُس دین سے کسی طور پر کوئی مناسبت نہیں ہوسکتی جو ہر معاملے میں شرافت و مروّت، وقار و متانت اور دوسروں کے جذبات کے پاس و لحاظ کی تعلیم دیتا ہے۔

بہرحال شادی بیاہ کے سلسلے میں یہ وہ ناپاک تثلیث (UN HOLY TRIO) ہے جو مل جُل کر ایک وحدت بن گئی ہے، یعنی عیسائیوں کے قول کے مطابق توحید بھی ہے اور تثلیث بھی ("تین میں ایک اور ایک میں تین") اور بہتر یہی ہے کہ تینوں کی جڑوں پر بیک وقت ضربِ کاری لگائی جائے ورنہ اگر کسی ایک کی بیخ کنی پر اکتفا ہوئی تو باقی دونوں فوراً اس تیسری کو بھی از سرِ نو زندہ کرلیں گی۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل درست نہیں کہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً اصلاح کی طرف قدم بڑھائے جائیں۔ ایسے معاملات میں ایک ہی بار بڑا اقدام مفید بھی رہتا ہے اور پائیدار بھی —!"

مجھے خوب اندازہ تھا کہ لوگ ان باتوں کو عقلی اور منطقی اعتبار ہی سے نہیں دلی طور پر بھی تسلیم کرلیں گے لیکن جب موقع آئے گا تو "مجبوریوں" کا ایک کوہِ گراں ان کے سامنے آن کھڑا ہوگا اور وہ مجھے بھی ہر طرح مجبور کریں گے کہ ان تقاریب میں شرکت کروں۔ لہٰذا پیش بندی کے طور پر راقم نے اپنی ذات

کی حد تک تین پختہ فیصلے کر کے ان کا 'میثاق' کے صفحات میں اعلان بھی کر دیا اور جامع مسجد خضراء سمن آباد کے اجتماعِ جمعہ میں بھی ـــ وہ تین فیصلے یہ تھے کہ: راقم الحروف آئندہ نہ ۱ کسی بارات میں شامل ہوگا۔ نہ ۲ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کے ہاں کسی دعوتِ طعام میں شریک ہوگا۔ نہ ۳ ہی کسی ایسی تقریبِ نکاح میں شرکت کرے گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو ـــ !"

مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملے میں کسی قدر 'شدت' کی صورت پیدا ہوئی لیکن میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ اس کے بغیر معاملہ کسی طرح ٹس سے مس تک نہ ہوتا ـــ الحمد اللہ کہ میرے رفقاء و احباب میں سے بہت سے لوگوں نے اس معاملے میں میرا پورا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں اس اصلاحی کوشش نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ بہت سے دوسرے احباب جو پورا ساتھ نہ دے سکے ان کے ساتھ میں نے ایک درمیانی صورت اختیار کر لی کہ نکاح کا انعقاد انہوں نے مسجد میں کر لیا جس میں میری شرکت ہوگئی۔ بعد ازاں کسی دعوتِ طعام کا اہتمام انہوں نے کیا جس میں میری عدم شرکت کو انہوں نے خندہ پیشانی سے گوارہ کر لیا۔ اور ان کی 'مجبوریوں' کے پیشِ نظر میں نے بھی ان پر نکیر نہ کی۔

قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حلقے میں البتہ مجھے زیادہ سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں شکر رنجیاں بھی ہوئیں۔ تعلقات کا انقطاع بھی ہوا۔ اور بعض بچپن کی منگنیاں بھی ٹوٹیں۔ لیکن الحمد للہ والمنہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان تمام چیزوں کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی!

اس معاملے میں میرے لئے سب سے کڑا امتحان اپنی سب سے بڑی بچی کی شادی کے موقع پر پیش آیا۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس موقع پر خواہ میں اپنی طے کردہ ساری پابندیاں پوری طرح نباہ لوں لیکن اگر رخصتی کے موقع پر میں نے دولہا اور ان کے چند عزیزوں کی تواضع صرف ٹھنڈے یا گرم مشروب سے بھی کر دی تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر

جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے میں نے ایک اور انقلابی قدم اٹھایا یعنی یہ کہ بچی کو بھی جمعہ کو مسجد دارالسلام، باغ جناح لے گیا۔ نماز جمعہ کے بعد نکاح پڑھایا اور اللہ ہی کے گھر سے اس کی رخصتی عمل میں آ گئی۔ اس طرح میرے گھر پر دو چار افراد کا بھی اس صورت میں آنا نہ ہوا جس پر کھینچ تان کر کے بھی "بارات" کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکتا!

اس کے بعد بڑے بچے کی شادی کا مرحلہ آیا تو ایک طرف تو اس کے لئے جو "بارات" کراچی گئی وہ کُل ڈھائی افراد پر مشتمل تھی۔ یعنی دولھا، اس کی والدہ اور سب سے چھوٹا بھائی ــــ (راقم خود ان دنوں دعوتی و تنظیمی سلسلے میں پہلے ہی سے کراچی میں تھا) دولھا کے دو حقیقی بھائی اور کوئی حقیقی بہن بھی اس "بارات" میں شامل نہ تھی، پھر یہ کہ جس جمعہ کو نمازِ جمعہ کے متصلاً بعد عقدِ نکاح ہونا تھا، اُسی صبح کو ٹرین سے یہ لوگ کراچی پہنچے اور اُسی شام کو دلھن کو لے کر لاہور واپس ہو گئے ــــ دوسری طرف رفیق مکرم قاضی عبدالقادر صاحب نے (جن کی بچی سے عقدِ نکاح ہونا تھا) راقم کی قائم کردہ مثال پر پورا عمل کر کے دکھایا اور اپنے قریب ترین اعزہ و اقارب کو بھی گھر پر مدعو نہیں کیا بلکہ مسجد ہی سے بچی کو رخصت کر دیا ــــ

اس کے بعد بحمداللہ سالِ رواں کے دوران راقم اپنی مزید دو بچیوں کی ذمہ داری سے اسی طور سے سبکدوش ہو چکا ہے۔

اس سلسلہ کی آخری یعنی حالیہ تقریب میں جس کے حوالے سے گفتگو کا آغاز ہوا تھا، راقم نے ایک نہایت مختصر خطاب کیا تھا جس کے بارے میں جناب م۔ش نے از راہ ذرہ نوازی یہ فرمایا ہے کہ "میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں کی تعداد میں مواعظ حسنہ میں شرکت کی ہے لیکن اس موقع پر میری رُوح نے ان کی تقریر دل پذیر سے جو اثرات قبول کئے وہ انمٹ تھے" اس میں راقم نے ایک تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی شان مبارکہ کے حوالے سے جو "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" کے الفاظِ قرآنی میں بیان ہوئی ہے حاضرین کو جرأت مندانہ اقدام کی ترغیب

دلائی تھی اور دوسرے سورۃ الانشراح کی آیاتِ مبارکہ "فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا o اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا o" کے حوالے سے تحدیثًا لِلنِّعْمَۃ عرض کیا تھا کہ اپنی ان مساعی کے ضمن میں جس اُخروی اجر و ثواب کا امیدوار میں ہوں اس کا تو میں محتاج ہوں ہی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ o — اس دنیا میں جو نقد انعام مجھے ملا ہے وہ' وہ آسانی اور سہولت ہے جس کے ساتھ میں تابڑ توڑ انداز میں اپنی اُن پہاڑ ایسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں جن کا تصوّر بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے — واقعہ یہ ہے کہ آج جب میں غور کرتا ہوں تو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی اِن ذمّہ داریوں کو زمانے کے دستور و معیار کے مطابق نبھانا ہوتا تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہتا کہ جسم و جان کی ساری توانائیاں صرف پیسہ کمانے کے لئے نچوڑ دیتا۔ نتیجۃً اللہ کے دین اور اس کی کتاب عزیز کی کسی خدمت کے لئے نہ میرے پاس کوئی وقت بچتا نہ قوت و صلاحیت — یہ سراسر اُس تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس تعالیٰ نے جب ایک جانب مجھے اس فیصلے کی توفیق ارزانی فرمائی کہ میرے جسم و جان کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اللہ کے دینِ متین اور بالخصوص اس کی کتابِ عزیز کی خدمت کے لئے وقف رہیں گی تو دوسری جانب میری توجہ اتباعِ سنّت کے اِس رُخ کی طرف بھی مبذول کر دی اور مجھے شادی بیاہ کے "اِصر" اور "اغلال" کے خلاف جہاد کا بیڑا اُٹھانے کی توفیق بھی مرحمت فرما دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج میں خود اپنے ذاتی حالات میں اُس تعالیٰ کے عظیم وعدوں یعنی "وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی" اور "فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی o" کی صداقت و حقّانیّت کا مشاہدہ کر رہا ہوں کہ تین سال کے اندر اندر اپنے چار بچّوں کی ذمہ داریوں سے اس طرح سبکدوش ہو گیا ہوں کہ کسی بار یا گرانی کا احساس تک نہیں ہوا۔ فَلَہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ۔!!

جہاں تک 'جہیز' کا تعلق ہے میرے نزدیک یہ بھی سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے۔ تاہم ابتداءً میں نے اس کے ضمن میں صرف

'عدم نمائش' پر زور دیا تھا۔ اب اللہ ہمت دے اور رفقاء احباب کمر ہمت کس لیں تو اس ضمن میں بھی مزید پیش قدمی ضروری ہے — اس سلسلے میں میرا اپنا جو معاملہ رہا ہے اس موقع پر اُسے بیان کر دینے میں بھی ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں ہوگا — اور وہ یہ کہ اگرچہ میری پہلی دو بچیاں بھی جو کچھ لیکر میرے گھر سے رخصت ہوئیں اس پر بھی موجود زمانے کے کسی بھی معیار کے مطابق "جہیز" کا اطلاق نہیں ہو سکتا تاہم حالیہ شادی میں یہ معاملہ بھی بحمد اللہ قدر مطلوب سے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ یعنی میری یہ بچی صرف ایک اٹیچی بھر کپڑے اور سوا دو تولے کا طلائی زیور لے کر میرے گھر سے رخصت ہوئی ہے!! —

خدا گواہ ہے کہ سطور بالا میں جو کچھ تحریر ہوا ہے اس میں نہ "عُجب" کو دخل ہے نہ ہی اس سے "تعلّی" مقصود ہے — ان تمام تفاصیل سے مقصود صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ کمر ہمت کس لیں اور اللہ کی تائید و توفیق کی امید کے سہارے شادی بیاہ کی تقریبات اور رسومات و لوازمات کے طومار کے "اِصر" اور "اغلال" کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ہ

بقیہ 'م۔ش' کی ڈائری

ہمارے معاشرے میں بیشمار بیٹیاں ایسی موجود ہیں جن کے ہاتھ پیلے اس لیے نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے والدین میں ڈاکٹر اسرار احمد کے ایمان کا جذبہ موجود نہیں گھروں پر بیٹھے بیٹیاں بوڑھی ہوجاتی ہیں کیونکہ ان کے والدین باراتیوں کے شایان شان استقبال اور جہیز کے تکلفات سے عہدہ برآ ہونے کی سکت نہیں رکھتے۔ یہ ایک گھمبیر سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ کیا محلوں کی مسجدوں کے امام صاحبان اور دوسرے اہل درد لوگ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب زندگی سے ایک ورق مستعار لے کر اس المناک سماجی مسئلہ کے حل کے لئے عملی اقدام اٹھانے کا سوچیں گے ؟"

فی نسخہ پچاس پیسے فی سینکڑہ -/۴۰ روپے
مطبوعہ: مکتبہ جدید پریس ۴ شارع فاطمہ جناح، لاہور

فہرست تصانیف

ڈاکٹر اسرار احمد

★	تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ	-/۶ روپے
★	مطالبات دین	-/۶ "
★	اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	-/۱ "
★	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	-/۲ "
★	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	-/۲ "
★	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اردو)	-/۳ "
★	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (عربی)	-/۴ "
★	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (انگریزی)	-/۵ "
★	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اوّل	-/۸ "
★	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ دوم	
★	قرآن اور امن عالم	-/۷۵ "
★	راہ نجات: سورۃ والعصر کی روشنی میں	-/۲ "
★	علامہ اقبال اور ہم	-/۲ "
★	عظمت صوم	-/۱ "
★	دعوت الی اللہ	-/۱ "
★	آیۃ الکرسی	-/۳۰ "
★	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ: الفاتحہ تا الکہف	-/۷ "
★	شہید مظلوم (شہادت حضرت عثمانؓ)	-/۳ "

Regd. L. No. 7360

MONTHLY ,, MEESAQ ,, LAHORE

Vol. 30 | December 1981 | No.-12

نشر القرآن

کیسٹ سیریز

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دروس قرآن حکیم اور مختلف دینی موضوعات پر مشتمل خطابات کے جدید حسب ذیل کیسٹ بھی دستیاب ہیں -

روپے

- خلاصہ مضامین قرآن مجید (موقع تراویح رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ) ۱۶ کیسٹ ۶۰ سی ۴۰۰/-
- کوڈ نمبر ۸۱ یوم استقلال (۱۴ اگست) پر خطاب ۶۰ سی (ایک کیسٹ) ۲۵/-
- کوڈ نمبر ۸۲ قرب الٰہی بذریعہ فرائض و نوافل (درس حدیث) ۶۰ سی (دو کیسٹ) ۵۰/-
- کوڈ نمبر ۸۴-۸۸ سورہ یٰسٓ (مکمل) ۹۰ سی (پانچ کیسٹ) ۱۴۵/-
- کوڈ نمبر ۸۹ سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیات ۶۰ سی (ایک کیسٹ) ۲۵/-
- کوڈ نمبر A سورہ الجمعہ (مکمل) ۹۰ سی ″ ۳۰/-
- کوڈ نمبر B سورہ الصف (مکمل) ۹۰ سی ″ ۳۰/-
- کوڈ نمبر C سورہ آل عمران آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ ۹۰ سی ″ ۳۰/-

سابقہ تیار شدہ کیسٹوں کی تفصیل اندر کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

المعلن: ناظم نشر القرآن کیسٹ سیریز، تنظیم اسلامی

۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور ۱۴ (فون نمبر ۸۵۲۶۱۱)